

غالب کے چند پہلو

عشس الرحمن فاروقی

انجمن ترقی اردو پاکستان

غالب کے چند پہلو

شمس الرحمن فاروقی

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۵۵۴

ISBN-969-403-096-X

(دیگر سرکاری اور ادبیات اور اردو کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے
اہم ہی اہمیت پاکستان کے توسط سے ادا ملتی ہے)

اقتساب

حضرت مولانا قیاز علی عرشی (۱۹۰۳ء تا ۱۹۸۱ء)

حضرت علامہ مالک دہم (۱۹۰۶ء تا ۱۹۹۳ء)

کی غالب شناسیوں

کو غراج عقیدت کے طور پر، کہ ان کی تحریریں سر زمین
غالب میں میری مشعل رہا ہیں۔

مگر چہ ہر قرنہ سخن آئے بود

ایک صفت سالکان یادے بود

تمہید

غالب پر کوئی نئی یا معنی خیز بات کہنا آسان نہیں رہا۔ لہذا اب غالب پر وہ لکھے جسے اپنی رسوائی مطلوب ہو۔ لیکن جب ابرام دوستان ہو تو اتنا بھی تقریباً اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے سی۔ ایس۔ لوگس نے اپنے ایک مجموعہ ”مضامین کا نام رکھا تھا، They Asked for a Paper۔ اس مختصر کتاب میں جو تحریریں شامل ہیں وہ فرمائش یا مجبوری کے تحت ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان لکھی گئی تھیں۔ کتابی شکل میں ان کی اشاعت برلورم مکرم چناب میرزا جمیل الدین عالی کی توجہ اور اصراہ کے باعث ممکن ہو سکی ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ”غالب افسانہ“ میرے افسانوں کے مجموعے ”سوار اور دوسرے افسانے“ میں بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت اجمل کمال کے ادارے ”آج“ کی مطبوعات سے متوقع ہے۔ میں اجمل کمال اور جمیل الدین عالی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ان دونوں مجموعوں میں اس افسانہ نما مضمون کی اشاعت منظور کر لی۔

شمس الرحمن فاروقی

الہ آباد،

۱۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء

فہرست

۷	حرفے چند
۹	تمہید
۱۳	غالب زمانہ حال کا مقبول ترین شاعر
۱۵	نوآبادیاتی ذہن اور تہذیبی بحران
۱۷	ذہنی جغرافیے اور رسوم میں تبدیلی
۲۳	کلام غالب اور نئی نثرانیات
۲۹	مطالعات غالب، سبک ہندی اور چیدوی مغربی
۵۵	سوانح غالب کا ایک پہلو اور مالک رام
۶۹	غالب افسانہ

جمیل الدین عالی
معتد اعزازی

حرے چند

شخص الرحمن فاروقی جیسے نایاب روزگار کے ایک مختصر سے مجموعہ مضامین پر حرے چند
لکھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تو کب

جب ہاتھ ہانگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
لیکن ان کی شہرت و عظمت اب اس درجہ اونچی ہو چکی ہے کہ ان کے مداحوں کی صف میں
شامل ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ بعض شعر ایسے ہوتے ہیں جو دل کی تڑپ رہاں پر لے ہی
آتے ہیں۔

”غالب نے چند پہلو“، غالب کے چند نہیں ہزار پہلو ہیں۔ غالب ہمارے واحد شاعر
ہیں جن کی تفسیر و تعبیر نامحال تو غیر ختم رہی ہے اور کسی گہینے معنی کا طلسم ایک ہی مرتبہ
پیدا نہیں ہو جاتا۔ ایک ہی مرتبہ اپنے سارے راز نہیں کھول دیتا۔۔۔ میں کوئی استاد انگریزی
نہیں، لیکن یہاں بھی خبریں آتی ہیں اور تقریباً ہر سال کے دورہ انگلستان و امریکہ میں بھی
ملتی ہیں کہ پچھلے سال یا پچھلے دو سالوں میں شکسپیر کے کچھ ہانگل نئے گوشے سامنے آئے
ہیں۔۔۔ خود بھول شخص الرحمن فاروقی بعض بڑے لوگ بہ ظاہر سامنے کی باتوں میں ایسے ایسے
گہنچے رکھ جاتے ہیں جن سے بڑے بڑے علماء و مفسرین آسمان گزر جائیں مگر جب ان کے
معانی و مطالب۔۔۔ اور اشارے۔۔۔ سامنے آئیں تو دل دہلا دیں۔

شخص الرحمن فاروقی کو ان کے بے شمار عدیم الخطیر کارناموں پر بھارت کے وہ تمام ادبی
اعزازات مل چکے ہیں جو وہاں (اور یہاں) کسی بھی ادبی کارکن کا استحقاق ہو سکتے تھے۔ آخر
کسی حوالے سے تو ملے۔۔۔ ملتے رہے۔۔۔ ہوں گے۔۔۔ یہ ان کی فہرست سازی کا موقع

نہیں۔ مختصر یہ کہ آج وہ پاک بھارت کی اردو دنیا میں ایک ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کتاب در کتاب کے مستحق۔ میں انھیں ذاتی طور پر تقریبات جانتے کے برابر جانتا ہوں مگر جزوی اختلاف رائے کے باوجود ایک بڑا محقق بڑا افکار مانا ہوں۔ اگر کبھی پاک بھارت میں ادبی اعزازات کا تبادلہ نکلا تو جس اہم شخص کا روقی صرف دو اعلیٰ دوسرے محترمین ہی کے ساتھ ہماری صفِ ازل میں ہوں گے۔ لیکن واللہ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ بہنوں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ جس طرح انھوں نے میری ترقی پر وہ تاریخ ساز کام کیا ہے اتنی مقدار کا نہ سکی، اس معیار کا کوئی کام غالب پر بھی کر گزریں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ممکن ہے اور دنیا بھر میں غالبیات کے ذخیرے اس اضافے کے منتظر ہیں۔

انجمن کو یہ مسودہ پچھلے سال، پورے چار برس زمینی سفر کے بعد ملا۔ حیرت مگر پاک ہند کے کئی تعلقات اس سے زیادہ حیرت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ بہر حال اب یہ قارئین کی خدمت میں حاضر ہے اس قوی امید کے ساتھ کہ بہت سے اہل نظر ان کی جھنیم اور موقف تعبیر پر رائے زنی کریں گے۔ اگر ہمیں معقول تعداد میں ایسے مقالے اور مباحث وصول ہوئے تو ہم انھیں قاروقی صاحب کو بھی بھیج دیں گے اور اگر انھوں نے جواب یا وضاحت کو ضروری سمجھا تو اس کے ایڈیٹن میں اس کتاب اور ان آراء (طلوعل مضامین نہ ہوں) کی اشاعت کر دی جائے گی۔ انشا اللہ

۱۵ جون ۲۰۰۷ء

تسمیہ

ہر زمانہ شعرائے سلف کو اپنے طریقے سے پڑھتا ہے۔ ہر زمانے کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ہر زمانہ اپنے ذوق کے مطابق اشعار اور شعرا کی درجہ بندی کرتا ہے۔ بڑے شاعر کے اکثر اشعار پر ہر زمانے میں اتفاق رائے کے باوجود ان اشعار کی معنویت اور مختلف اشعار کے مابین قبولیت اور ترجیح بھی مختلف ہوتی ہے۔ گزشتہ تین پچیس برس میں جس غالب سے ہم آشنا ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک بجنوری اور شیخ اکرام کے غالب سے مختلف ہے۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ اب جو غالب ہمارے سامنے آئے گا وہ گزشتہ ربع صدی کے بھی غالب سے تھوڑا بہت مختلف ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا کو اردو کے کلاسیکی معیاروں اور اردو کی کلاسیکی شعریات کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش شروع ہو رہی ہے۔

غیر شعوری طور پر سبھی، لیکن حالی نے یہ بات کم و بیش ثابت کر دی تھی کہ غالب کو اگر مغربی شعریات کی روشنی میں پڑھا جائے تو ہم انھیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ لیکن حالی کی بات اتنی ہی نہیں تھی۔ انھوں نے بھی ثابت کیا کہ غالب کو ہم مغربی معیاروں سے پرکھیں تو وہ بڑے شاعر ثابت ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ مغربی معیاروں کے بارے میں حالی کی معلومات زیادہ گہری نہ تھی، لیکن ان لوگوں سے تو زیادہ ہی تھی جو ”مقدمہ شعر و شاعری“

چند کر شاعری کی ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالی کے بعد غالب پر جو کچھ لکھا گیا اس پر مغربی معیاروں کا اثر بہر حال نمایاں ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں کہ روایتی قسم کے شرح نگار تھے، لیکن ان کی شرح غالب (۱۹۰۰ء) میں مغربی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ بجنوری سے ہو چاہو آل احمد سرور، مشتاق حسین، مجتوں گور کچھوری، آفتاب احمد، کلیم الدین احمد وغیرہ تک آیا اور پھر ہم اسے محمد حسن عسکری، سلیم احمد، وزیر آغا، حامدی کا شمیری وغیرہ تک پہنچاتا دیکھ سکتے ہیں۔ غالب صدی تقریبات کے دنوں میں غالب کی شرح و تفہیم پر نئے سرے سے زور دیا گیا اور گمان چند نے غالب کے اس سادے کلام کی شرح لکھی جو حدود اول و دوم ان سے خارج تھا اور جسے بجنوری پھر اسی کے بعد (اکادمی کا شعر و ادب کے علاوہ) توجہ سے محروم رکھا گیا تھا۔ گمان چند کی شرح ان کی شعر فنی طور تک نہ رہی بلکہ زندہ ثبوت تو ہے، لیکن ان کے مغربی نقیبات بھی اس میں جھلکتے ہیں۔ یعنی وہ خیال بندی کی شاعری کو نظر استخوان سے نہیں دیکھتے۔

غیر حدود اول کلام کے ہر شعر کی شرح انتہائی عرق ریزی اور جاں فشانی سے لکھنے کے باوجود، گمان چند کو خیال بند اور تجرید پسند غالب سے اہم ردی نہیں پیدا ہوئی۔ ان کا خیال یہی رہا کہ غالب نے جس کلام کو سوچ سمجھ کر مسترد کر دیا تھا، وہ بڑی حد تک معمولی اور بے لطف ہے۔ کیوں کہ اس میں غیر ضروری وجہیگی زیادہ ہے، معنی کا لطف کم۔ اس رائے سے پورا اتفاق ممکن نہیں، لیکن یہ ضرور درست ہے کہ مسترد کلام کا بڑا حصہ اس قدر لائق، اس کے مضامین اس قدر ہر ایک اور ان مضامین اور دیگر دلوں پر استعاروں کی بنیاد رکھنے اور ان کا رد و کار و خیال پر ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے کثیر غور و فکر و رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں بہ ظاہر رہا کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ رہا کی جس کی کو غالب نے ”مستی“ قرار دیا ہے:

سے کش مضمون کو حسن ربط خط کیا چاہیے

لغزش رفتہ خار مستی تحریر ہے

لیکن اس ”مستی“ تحریر کے باعث شعر کا حسن اگر بھروسہ نہیں تو مخفی ضرور ہو جاتا ہے۔

بہر حال، نسخہ حمید یہ اور پھر نسخہ شیرانی کے متداول ہو جانے پر یہ بات غلط ثابت ہو جانی چاہیے تھی کہ غالب کا ادائیگی کلام سراسر مشکل ہے۔ لیکن کوئی بات اگر مشہور ہو جائے (خاص کر غلط بات) تو اسے لوگوں کے حافظے اور یقین سے خارج کرنا تقریباً ممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اب بھی عام ہے کہ غالب نے شروع شروع میں بہت ”مشکل“ کلمہ اور بعد میں وہ ”طرز میں“ کی طرف مائل ہوئے۔ بالکل دسم نے بہت پہلے کہا تھا کہ غالب کی اکثر غزلیں جنھوں نے غالب کو غالب بنایا۔ زمانہ نوجوانی یا جوانی کی ہیں نہ کہ اسی زمانے کی جب وہ مشکل پسندی ترک کر چکے تھے۔ اس کے باوجود یہ بات مشہور ہے کہ غالب کا ادائیگی کلام سارے کا سارا اوق اور بے لطف اور ڈولیدہ فارسیہ (بلکہ فارسی) میں مخرق ہے۔ پھر بھی ان غلط فہمیوں کے باوجود غالب کے پورے کلام پر توجہ گزشتہ کچیس تیس برس کے مطالعات غالب کا نمایاں پہلو ہے۔

تمام بڑے شعرا کی طرح غالب میں بھی یہ صفت ہے کہ ان کا کلام چاہے جتنی بار پڑھا جائے اس کی تازگی برقرار رہتی ہے زیادہ تر مطالعے میں بعض ایسے شعر سامنے آتے ہیں جو سمجھ یا معنی کے اعتبار سے بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ اب تک یہ آنکھوں سے او بھل کس طرح رہے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کے کلام میں فن کی باریکیاں اور چالاکیاں اور معنی کی جنہیں اس قدر ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان شعروں میں بھی نئے پہلو نظر آجاتے ہیں جنہیں ہم بار بار پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی پڑھنے والے پر کبھی کوئی نکتہ اچانک روشن ہوتا ہے جب کہ دوسرا پڑھنے والا اس نکتے کو پہلے ہی دیکھ چکا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر پڑھنے والے کے لیے ہر بار تازگی کا سامان مہیا رہتا ہے۔ غالب کے یہاں ایک اور خصوصیت بھی ہے جو عام طور پر ہمارے شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ اس خصوصیت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ بعض اوقات سرسری سی بات کہہ دیتے ہیں اور پڑھنے یا سننے والا اس شعر پر سے یوں ہی گزر جاتا ہے۔ لیکن غور و فکر کے بعد (اور کبھی کبھی اچانک) انکشاف ہوتا ہے کہ بات سرسری نہیں، بلکہ تہہ دار ہے۔ لہذا یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے

کہ جس شعر کو ہم طیرانہم سمجھ رہے ہیں وہ دراصل اہم ہو۔ مثلاً ایک مشہور راوی یہ ظاہر سادہ
 سا شعر ہے:

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
 اب کسی بات پر نہیں آتی

یہاں یہ ظاہر کوئی نکتہ نہیں۔ لیکن اچانک آشکاف ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعے کا ملبوم یہ
 بھی ہو سکتا ہے کہ: ہنسی کسی بات پر نہیں آتی، بلکہ بے بات کی بات پر ہنسی آتی ہے۔ اب یہ
 شعر یاس و افسردگی کی جگہ جنون اور ذہنی اختلال کے مضمون پر مبنی ہوتا ہے۔ غالب کی اس
 خصوصیت کے باعث ان کا انتخاب بنانا بہت مشکل ہے، کیوں کہ عجب نہیں کہ جس شعر کو
 ہم نظر انداز کر گئے ہوں اس میں بھی کوئی نکتہ ہو۔

غالب زمانہ حال کا مقبول ترین شاعر

غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں کہ نہیں؟ اس سوال پر بحث ہو سکتی ہے۔ اکثر لوگ اس سوال کا جواب ”ہاں“ میں دیں گے۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ غالب ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر اور پہلے بڑے جدید شاعر ہیں۔ وہ اگرچہ اس صدی کے شروع ہونے سے بہت پہلے مر گئے لیکن ان کا کلام اس صدی کا استعارہ اور ان کے بیان کردہ مسائل اس صدی کے مسائل کا جوہر ہیں۔ لہذا غالب کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے ہی ہو سکتا ہے کہ کلاسیکی شعرا میں غالب کا کیا مقام ہے اور وہ اس نقطہ نظر سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے خواص اور صفات ہیں جن کی بنا پر غالب ہمارے عہد کے سب سے مقبول اردو شاعر ہیں؟ میں فی الحال اس دوسرے ہی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ بات تو سامنے کی ہے کہ شاعری کے اعتبار سے ہماری صدی استعارے اور ابہام کی صدی ہے اور غالب کی شاعری کے نمایاں ترین اوصاف اس میں استعارے کی وسعت اور رنگارنگی اور ابہام کی پیدا کردہ کثیر المعنویت ہیں۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی، بلکہ شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ اصل سوال یہ ہے کہ غالب نے استعارے کو کس طرح برعکس کیا استعارے سے غالب نے انکشاف کا کام لیا یا اس کے ذریعے عام، معمولی حقائق میں بھی اسرار کی کار فرمائی ثابت کی؟

کیا استعارے کو لادراک و انکشاف حقیقت کا ذریعہ کہہ سکتے ہیں؟ یہ بحث مغربی شعریات میں غلطی سے اٹھی، خاص کر جب پیوٹم نے اس بات سے انکار کیا کہ استعارے کے ذریعے علم

حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی زمانے میں اسپنوزا نے انجیل کی تعبیر و شرح کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ انجیل کے بیانات کو استعارے کی سطح پر قبول کیا جائے یا لغوی سطح پر؟ یہ سوال اس لیے اہم تھا کہ دونوں طرح کی کارگزاریوں میں انجیل کے احکام و اقوال کی عملی معنویت اور ان کا معنی بر حقیقت ہونا معرض خطر میں پڑ سکتا تھا۔ اسپنوزا نے پلٹا غریب فیصلہ کیا کہ ہمیں انجیل کے الفاظ کو لغوی حیثیت میں قبول کرنا چاہیے اور اس بات سے بحث نہ کرنا چاہیے کہ ان کو کج بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ نہیں۔

عرب شعریات میں استعارہ وسیلہ 'علم' کے طور پر نہیں بلکہ توسیع معنی کے وسیلے کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ یعنی عرب شعریات (اور بڑی حد تک تمام کلاسیکی مشرقی شعریات) میں استعارے کا اصول یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے کوئی بات ثابت یا مشکف کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں استعارہ اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے بعض اوقات وہ معنی بھی وجود میں آتے ہیں جو کلام (Discourse) سے منطقی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اشاریاتی Semiotic تعلق رکھتے ہیں۔ امام عبدالقادر جرجانی نے دو طرح کے استعاروں میں فرق کیا ہے۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد حیاتی ہوتی ہے۔ جرجانی کا قول ہے کہ ایسے استعاروں کے معنی متعین ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرح کے استعارے وہ ہیں جن کی بنیاد عقلی ہوتی ہے۔ جرجانی کا کہنا ہے کہ ایسے استعاروں کے معنی لامحدود ہوتے ہیں۔

غالب نے اپنی تحریروں میں جرجانی کا حوالہ کیوں نہیں دیا ہے اور نہ کہیں استعارے سے بحث کی ہے۔ لیکن چوں کہ ان کا مشرقی شعریات، شعری ذوق اور خام کر سبک ہندی کی شعریات کا ساتھ پر داشت تھا۔ اس لیے ان کے یہاں جرجانی کے بیان کو وہ دوسری قسم کے استعارے کی کار فرمائی پیش از پیش نظر آتی ہے۔ غالب کے یہاں ان استعاروں کا عمل انکشاف کا نہیں بلکہ سوالیہ نشان کا ہے۔ یعنی غالب کے استعارے ہمیں کائنات اور وجود کے بارے میں استفہام و اختلاف پر مائل کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کا مزاج چوں کہ استفہام اور تجسس سے عمارت ہے، اس لیے غالب کا کلام (جیسا کہ میں نے اوپر کہا) بیسویں صدی کا ہی

استعارہ بن گیا ہے۔

نوآبادیاتی ذہن اور تہذیبی بحران

غالب کے بارے میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ وہ ایسے دور میں پے بڑھے جو ہندوستانی سیاست اور سماج میں زوال اور انتشار کا دور تھا۔ یہ بات صرف جزوی طور پر سچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زوال اور انتشار تو غالب کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی اعتبار سے زوال کا دور انھارویں صدی کے وسط سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ غالب کے دور اور اس سے ماقبل زمانے میں اصل فرق یہ ہے کہ غالب کے زمانے میں ہندوستانی تہذیبی اقدار کی بھی قوت اور سچائی مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اقدار جو غالب سے نصف صدی پہلے پامال ہونا شروع ہو گئی تھیں، اب ان کے بارے میں یہ شک پیدا ہو چلا تھا کہ ان اقدار میں یہ قوت ہے بھی کہ نہیں کہ وہ انسان کو کائنات میں قائم رہنے اور کائنات کے موجودات و امکانات کی وجہ بیان کرنے کی سعی میں مدد ہو سکیں۔ غیر ملک، غیر زبان، غیر تہذیب، یہ چیزیں سمر کے زمانے میں اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں لوگوں کو پھر بھی یہ یقین تھا کہ وجود کے بارے میں جن نظریات اور تصورات کے وہ حامل ہیں، وہ صحیح اور کافی ہیں۔ غالب کے زمانے میں اس یقین پر کاری ضرب پڑی اور زندگی کے ہر شعبے، حتیٰ کہ تہذیبی اقدار میں بھی مغربی اثرات کی برپا کر وہ تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ اس تبدیلی حال کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب جیسے ذہنوں کو، جو پرانی تہذیب کے پاسدار تھے، لیکن جنہیں بدلتی ہوئی دنیا کا احساس بھی تھا، وجود کی سطح پر یہ خوف اور شک پیدا ہوا کہ اشیاء اور حقائق کیا واقعی ویسے ہی ہیں جیسے کہ ان کے بزرگوں کے تصور کائنات (World View) میں تھے یا اشیاء اور حقائق کچھ اور ہیں؟ یا اگر وہ کچھ اور نہیں بھی ہیں، تو کیا ان کو دیکھنے کے طریقے کچھ اور بھی ہیں اور یہ طریقے ان طریقوں سے مختلف ہیں جو انھوں نے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور

اپنے تہذیبی شعور سے حاصل کیے تھے؟

اشیاء دراصل ویسی نہیں ہیں جیسی وہ نظر آتی ہیں۔ یہ صوفیوں اور فلسفیوں کا عام عقولہ ہے۔ اس عقولے تک پہنچنے کے لیے غالب اور ان کے معاصروں کو مغربی تہذیب یا مغربی علم کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن صوفی اور فلسفی کا یہ کہنا کہ عالم ”ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے“ اور ”معنی رکھتا تھا اور مغربی تہذیب کی روشنی میں یہ معلوم کرنا اور معنی رکھتا تھا کہ“ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے“ کے وہ معنی نہیں ہیں جو مشرقی صوفیوں اور فلسفیوں نے جان کیے تھے۔ اس عرصہ خشک و ریافت نے ہندو اسلامی تہذیب میں ایک بحر ان پیدا کر دیا۔ غالب اسی تہذیبی بحر ان کے شاعر ہیں اور یہ بحر ان لب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے غالب ہمیں آج بھی ہمارے معاصر نظر آتے ہیں۔ غالب کے اہم معاصرین ذوق، مومن، میر انیس، بھر در چہ دوم کے اہم شعر امثالہ و بصر علی خاں نسیم و غیرہ سب اس بحر ان سے بے خبر تھے جو ہماری تہذیب میں انگریزوں کے اثر سے رونما ہو رہا تھا اور بڑی حد تک رونما ہو بھی چکا تھا۔ غالب کی بڑائی کا کاروبار بڑی طور پر اس بات میں ہے کہ انھوں نے اس بحر ان کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اسے شعر بنا کر پیش بھی کیا۔

اس بحر ان کو محسوس کرنے سے اور شعر بنا کر پیش کرنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ غالب نے زمانہ ”نوجوانی ہی میں“ ”دماغ فراق سہجہ شب کی جلی ہوئی“ جیسے شعر کہ لیے تھے۔ اس بحر ان کو محسوس کرنے اور اسے شعر میں منتقل کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ غالب نے اس بات کو اپنے کلام کا بنیادی استعارہ بنایا کہ اشیاء جیسی نظر آتی ہیں وہ ان کی اصل صورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے استنبہامیہ کا استعمال تمام اردو شعرا سے زیادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ سیر سے بھی زیادہ۔ یعنی اشعار کے تناسب کے اعتبار سے غالب کے یہاں استنبہامیہ اشعار کا تناسب میر سے زیادہ ہے۔ جس شخص نے اپنے دماغ ان کا آغاز ہی استنبہام سے کیا ہو اور اس استنبہام کے ذریعے نظام کائنات پر کتنے عجیب انداز میں نظر ڈالی ہو، اس کے استنبہامی مزاج کے ہمارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں:

قتل فریادی ہے کس کی شوٹی تحریر کا
 کاغذی ہے پیرہن ہر حکم تصویر کا
 اس کے مقابلے میں میر کو رکھیے کیوں کہ میر خود بہت بڑے استغہای ہیں:
 کوئی ہو محرم شوٹی ترا تو میں پوچھوں
 کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

جیسا کہ میں نے کہا، میر خود بہت بڑے استغہای ہیں۔ لیکن ان کا استغہام (مندرچہ بالا شعر میں) دو مضمرات کا حامل ہے۔ اول تو یہ کہ کوئی نہ کوئی ہستی یا شخص ایسا ہے جو ذات باری تعالیٰ کی "شوٹی" "مکا" "محرم" ہو۔ دوسری بات اس استغہام میں یہ مضمر ہے کہ باری تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، اس لیے اگر اس نے بزم عیش جہاں برہم کی بھی ہے، تو اس کار از اس کو معلوم ہو گا جو ذات باری کا محرم ہے۔ غالب کے شعر میں دونوں ہی مضمرات کا پتا نہیں۔ صرف مطلق استغہام ہے کہ وہ کون ہے جس کی شوٹی تحریر نے قتل کو کاغذی پیرہن پہنا دیا۔ (کاغذی پیرہن پہننا، فریادی ہونا۔) اس پر طرہ یہ کہ قتل وجود میں آتا ہی جب ہے جب وہ کاغذی پیرہن پہنے۔ لہذا وجود خود مساوی ہے فریاد کے۔ تو یہ کس کی شوٹی ہے جس نے وجود = فریاد کی نگین کی؟

ذہنی جغرافیے اور رسوم میں تبدیلی

میں نے اوپر کہا ہے کہ غالب تہذیبی بحران کے پیدا کردہ اس احساس کے شاعر ہیں کہ اشیاء کیسے نہیں ہیں جیسی نظر آتی ہیں، حقائق وہ نہیں ہیں جو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کے یہاں رفتار = جمود، وجود = عدم، عقل = وحشت، غیب = ظہور، نگارہ = ناچنائی جیسے مضمون عام ہیں۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر غالب نے اس ذہنی جغرافیے کو بھی بدل دیا اور اس داخلی سر زمین کی آب و ہوا بھی بدل دی جن سے غزل کی شاعری عہدات ہے۔ یہاں بھی میر سے قائل خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ میر کے یہاں داخلی

خطر افیہ اور تھذیبی آب دہوا کے بدلنے پاس میں تہذیبی ممکن ہونے کا ذکر نہیں۔ میر کی دنیا خود منکشی ہے، اس میں انسان ذہن و خوار بھی ہے اور منصور و مظفر بھی۔ لیکن اس میں کوئی تغیر نہ تھا۔ عشق کے جنگل کی دہشت یا کی ایسی تھی کہ وہاں شیروں کو بھی قحط یرہ ہو اور جہاں خود قحط کو جان کا خطرہ ہو:

کیا کم ہے ہولناکی صحرا سے عاشقی کی
 شیروں کو اس جگہ پہ ہوتا ہے قحط یرہ
 ملا جو عشق کے جنگل میں قحط میں نے کہا
 کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا
 (میر)

لیکن غالب کے یہاں خطر افیہ بدلا ہوا ہے۔ غالب کے صحرا میں قحط کا گزر ہی نہیں۔ اس صحرا کے دیوانے سر جد تماشا سے بہت دور ہیں اور خود قحط کو ان سے ملنے کا اشتیاق ہے:

میر آں سو سے تماشا ہے طلب گاروں کا
 قحط مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

یہ اور بات ہے کہ فنی اعتبار سے میر کے دونوں شعر غالب کے شعر سے بہتر ہیں۔ لیکن یہاں جو چیز لائق توجہ ہے وہ میر اور غالب کا فنی نکاتیں نہیں بلکہ وہ ذہنی آب دہوا اور داخلی خطر افیہ ہیں جن سے میر اور غالب کے اشعار عبادت ہیں:

اسد ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں
 کہ ہے سر پنچہ ’مڑگانہ آہو پشت خارا نیا

یہاں جنوں جولانی اور بے سرو پائی مساوی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ دشت جس میں کوئی بے سرو پا شخص جنوں جولاں ہو، اس دشت سے مختلف ہو گا جس میں خوف شیر ہو۔ کیوں کہ اس دشت کے ہونے کی دلیل ہی اس کا نہ ہونا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
 میری رفتار سے بھاگے ہے بیاہاں مجھ سے

یعنی رفتار بخشی تیز ہوگی، یہاں اتنی ہی تیزی سے دور ہوتا جائے گا۔ لہذا قہار برادر ہے بخود کے اور یہاں کا وجود اس کے عدم ہی میں مضمر ہے۔

مرزج مفروضات اور معتقدات کو پلٹنے دیا ان کا ٹکس بیان کرنے کا۔ جہاں ہماری کلاسیکی شاعری کا۔ جہاں نہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ وہاں یہ بات بھی مرزج مفروضات میں داخل ہے کہ غزل کا مرکزی کردار، یعنی عاشق، ر سوم شکن اور مقبول اقتدار کو مسترد کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ اس کے مقابل تاج محل، ہم نہیں، ازاد، شیخ وغیرہ ہیں جو مرزج اقتدار و سوسم کے حامی اور ان کو قائم کرنے والوں کے معاون ہیں۔ یعنی کلاسیکی غزل کی شہریات میں مرکزی کردار شروع ہی سے اور اپنی اصل ہی کے اعتبار سے Subversive مفادات کا حامل ہوتا ہے۔ آج کل کے وہ مغربی نقاد جو خود کو Cultural Materialist یا New Historicist کہتے ہیں، ان کے لیے کلاسیکی غزل کی دنیا بے حد دلچسپ اور حیران کن ثابت ہوگی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ لاد اگرچہ ہر زمانے میں حاکم طبقے کے اقتدار کو قائم کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے، لیکن وی ہوش لاد یہ ان اقتدار کو مستحکم کرنے کی ظاہری کوشش کے درپردہ ان اقتدار کو Subvert کرنے یا معرض سوال میں لانے کا کام کرتا ہے۔ نئے تاریخیات پرستوں سے بہت پہلے میخائیل باختین (Mikhail Bakhtin) نے یہ نظریہ Camivalisation کے نام سے پیش کیا تھا۔ ہمارے یہاں یہ عالم ہے کہ غزل کی دنیا کا مرکزی کردار خود ہی غزل در ہے کا Subversive ہوتا ہے۔ غالب کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ اس Subversion کو بھی Subvert کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مرزج اقتدار سے نامطمئن تھے اور انہیں شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقتدار کا یہ Subversion ان کے نزدیک اس کا پالٹ کا استعارہ تھا جو ہماری تہذیب اور ہمارے تہذیبی شعور میں رونما ہو رہی تھی۔ چنانچہ جہاں میر یہ کہتے ہیں:

ہاتھ دامن میں ترے ہاتھ جھنجھلا کے نہ ہم

اپنے جاسے میں اگر آج گرہاں ہوتا

وہاں غالب کہتے ہیں:

مگر دنیاز سے تو نہ آیا وہ رہا پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے

حیر کے حکم کا گریبان چاک ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ معشوق کے دامن کو اپنا پدافنا ہے۔
اس میں چالاکی ہے، لیکن عاشق اور معشوق دونوں کی جگہ متعین ہے۔ جب کہ غالب نے
دونوں کی جگہ کو Subvert کر دیا ہے۔ اسی طرح غالب یہ کہہ سکتے ہیں کہ معشوق بھی شوخ
اور بے باک ہو اور عاشق بھی شوخ و بے باک ہو:

ہے وصل ہجر عالم تنہا و مضطرب میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے

اس کے بجائے کہ عاشق اپنی رسوائی کے سامان کرنے میں خود خالق ہو، غالب اس کے مقام کو
مہدم کر کے معشوق کو یہ کام سونپنا چاہتے ہیں:

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سہی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

اسی طرح نہ صرف یہ کہ معشوق کا حسن محض مصنوعی ہے:

بچہ مت رسوائی انداز استغناء سے حسن
دست مرہون حنا رخسار رحمن قادر تھا

بلکہ معشوق کی وفا بھی محض اتفاق پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ رونے و صوفے سے خدایا
معشوق مہربان ہو جائے:

دفا سے دلبراں ہے اتفاق دونہ اسے ہدم

اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

مرذعہ القدر کو مہدم کرنے کا معرض سوا میں لانے کے رجحان کی بنا پر غالب کے

کلام میں ایک طرح کی شوخی، ایک طرح کی Irreverence اور تصویری سی کلیتہا ہے جو بیسویں صدی کے ذہن کو برا نگینہ کرتی ہے، کیوں کہ اسے اس میں خود اپنی کش مکش، اپنے شکوک اور اپنے Dilemmas کا عکس نظر آتا ہے۔ میں چند اشعار مزید نقل کرتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی سرورج یا مقبول مضمون کے برعکس مضمون پر مبنی ہے:

فکرِ سخن یک انشا زمرانی خموشی
دود چراغ گویا زنجیر ہے صدا ہے
سراپا رہن عشق و تاگزیرِ افسوس
عبادتِ برقی کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیکر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں درقِ ناخواندہ
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا دامن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے کسی کی شرم
کیا ہے ترکِ دنیا کا بی سے
ہمیں حاصل نہیں ہے حاصلی سے
خدا یعنی پدر سے صریاں تر
پھرے ہم در پدرِ ناگاہی سے
کچھ نہ کی اپنے جتولہ ہارسا نے دردِ یاں
ذوقِ ذوقِ روکشِ خود شیوِ عالمِ تاب تھا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
دفا مقابل و دعوای عشق ہے بنیاد
جنونِ سافید و فصلِ مکمل قیامت ہے

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
 سر جاتے یا رہے نہ رہیں پے کبے بغیر
 اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے نہیں
 اس در پہ نہیں پار تو کبے ہی کو ہو آئے
 لادم نہیں کہ خطر کی ہم چروٹی کریں
 جاتا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
 تھری دفا سے کیا ہو خلائی کہ دہر میں
 تھرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری بناب میں
 پوچھا اگرچہ پار نے احوال دل مگر
 کس کو دماغ منت گفت و شنود تھا
 تپتے بغیر سر نہ سکا کوہکن اسد
 سرگشتہ خدا رسوم و قیود تھا
 بے خودی ہے سبب نہیں غالب
 کہتہ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
 ختا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
 بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
 طاقت بقدر لذت آزاد بھی نہیں

یہ اشعار میں نے بے تکلف حافظے سے نقل کیے ہیں، ورنہ اس طرح کے شعر دیوان
 کے ہر صفحے پر مل جائیں گے۔ ان اشعار میں فنی خوبیاں اور معنی کی گہرائیاں بھی ہیں۔ لیکن فی الحال

یہ اس لیے توجہ طلب ہیں کہ ان میں جو نظریہ کائنات نظر آتا ہے وہ ہندو اسلامی تہذیب کے نظریہ کائنات کی مکمل توثیق نہیں کرتا، بلکہ اس سے ایک حد تک منحرف ہے۔ حالی نے اس بات کو یوں کہا تھا کہ غالب ہر چیز میں اپنی روش الگ رکھنا پسند کرتے تھے۔ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن جو سوال غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اپنی روش الگ رکھنے کا یہ ہی طریقہ کیوں؟ مومن بھی بہت بڑے انفرادیت پرست تھے اور ان کے کلام کی روش بھی اوروں سے بہت مختلف ہے۔ لیکن مومن کی دنیا سراسر وہ دنیا ہے جو رسمی طور پر انھوں نے دورے میں پائی تھی۔

مومن اس دنیا کو کسی شک یا خوف کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برخلاف غالب کا یہ عالم ہے کہ زمانہ کو جو جانی ہی میں وہ خدا کو باپ سے مہربان تر جانتے ہوئے اپنی آلودہ گردی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ناقابلِ تھی۔ یعنی وہ خود ناقابل (ناقابل) تھے، یا پھر خدا نے ان کو قبول نہ کیا، اگرچہ وہ پھر سے مہربان تر تھا۔

کلام غالب اور نئی نشانیات

غالب کے بارے میں اکثر کہا گیا ہے کہ وہ شروع میں بیدل سے متاثر تھے۔ خود غالب نے اپنے اوائلی کلام میں بیدل کو انہی بار خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ بیدل کو ان کا معنوی استاد کہا جاسکتا ہے۔ لیکن شروع کے غالب پر ناسخ کا بھی اثر بہت قلیل ناسخ کی شہرت کا ستارہ ان دونوں گردش میں ہے اس لیے ہم لوگ غالب پر ناسخ کے اثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں کی شاعری کا بڑا حصہ (نور غالب کا تقریباً سارا غیر متداول کلام) خیال بندی پر مبنی ہے۔ اعظم الدولہ سرور نے ”عمدۃ نتیجہ“ میں غالب کا ذکر اس زمانے میں لکھا تھا جب غالب بہت نوجوان تھے۔ سرور نے غالب کو خیال بندی کا شائق بیان کیا ہے۔ خیال بندی کی بنیادی صفت یہ ہے کہ مضمون کی ندرت ازل ہے، چاہے مضمون خود بہت خوب صورت یا مروج معیار کا پابند نہ ہو۔ غالب نے خیال بندی والے مضامین میں عقلی استعارے بہت

برتے ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ ان کا کلام باخ سے بہت زیادہ رنگ و بوی معلوم ہوتا ہے۔ عقلی استعارے اور تشبیہات کے تعلق پر مختصر بحث کر کے میں گفتگو ختم کرتا ہوں۔

تشبیہات کا بنیادی اصول ہے کہ کسی شے کو کسی شے کا نام دینا جس سے تشبیہ نہیں بلکہ کسی شے کے برابر ظہور لیا جائے۔ استعارہ اپنی اصل شکل میں اس شے کا نام دینا ہوتا ہے جس کو اس کا مستعار منہ کہتے ہیں۔ مثلاً یہ استعارہ ہے "زید شیر ہے" لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ "شیر زید ہے"۔ یعنی جہاں جہاں "شیر" درج یا مرقوم ہو، ہم وہاں زید فرض کریں تو یہ تشبیہاتی عمل ہے۔ عقلی استعارے میں تشبیہات کا اصول اکثر کار فرما ہوتا ہے۔ غالب نے اس کے ذریعے بھرپور کام لیا ہے کہ مروج مفروضات کو پلٹنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر میر:

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہو اے آئی تھی

رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

یہاں معشوق کا باغ میں چاند و زمرہ کی دنیا کا عمل ہے۔ باغ میں اس کا گلاب کے پھول اور سرو کو غلام بنالینا استعاراتی عمل ہے (یعنی گلاب کا پھول اس کے چہرے کا غلام ہے اور سرو کا بیڑ اس کی قامت کا غلام ہے۔ یعنی معشوق کے چہرے اور گلاب کے پھول، اس کی قامت اور سرو کے درخت، میں وہی رشتہ ہے جو مالک اور غلام میں ہوتا ہے۔ مالک = اعلیٰ، غلام = دہنی) لہذا میر کے یہ ظاہر سادہ سے مصرعے میں کئی استعارے ہیں لیکن ان کی بنیاد حیاتی ہے۔ لہذا ان کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ اب غالب کے شعر دیکھیے:

ہو اے سیر گل آئینہ بے مہری قائل

کہ اندازِ بزمِ عظیمین بیکل پسند آیا

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آتا تھا

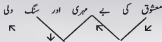
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

سطحی طور پر ان دونوں شعروں میں صدمت حال وہی ہے جو میر کے یہاں ہے۔ یعنی معشوق کا باغ کی سیر کو چاہا۔ لیکن داخلی طور پر ان میں بنیادی اختلافات ہیں۔ تصور کائنات کی

سج پر فرق یہ ہے کہ یہاں ہر چیز کا مرتبہ اور مقام متعین ہے۔ ۱۔ معشوق کو ہوائے تکلیف (= ترغیب) دی۔ یہ بات پہلے سے طے ہے کہ غیر لوگ (مشتاق رقیب یا وہ جو عاشق کے The Other ہیں) معشوق کو ترغیب دیتے ہیں۔ ۲۔ معشوق کا حسن و قامت گل و سرود کے قامت سے کہیں بہتر ہے۔ ۳۔ مظاہر قدرت بھی معشوق پر عاشق ہوتے ہیں۔ غالب کے یہاں تصور کائنات مختلف ہے، کیوں کہ دونوں شعروں میں معشوق بالارادہ سیر باغ کو نکلا ہے۔ یعنی وہ کسی غیر کی ترغیب کا محتاج نہیں ہے۔

استعداداتی طور پر غالب کے شعروں میں بنیادی بات یہ ہے کہ انا کے استعارے Semiotics کے عالم سے ہیں۔ یعنی یہاں بعض چیزیں بعض اور چیزوں کے برابر ہیں، ان کی نمائندہ نہیں ہیں۔ حسب ذیل فقراتوں پر غور کیجئے۔

پہلا شعر:



معشوق ← ہوائے سیر گل → ہے مہری قافل

↓ ↓

بہل بنوں انداز غلطیوں بہل

یعنی معشوق کا فعل = ہوائے سیر گل

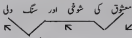
ہوائے سیر گل → ہے مہری قافل

ہے مہری قافل → پسندیدگی انداز بنوں غلطیوں بہل

بہل → گل

(اس نشان (←) سے عمل مراد ہے اور اس نشان (→) کا ہم دگر برابری مراد ہے۔)

دوسرا شعر:



معشوق ← اٹھے تھے سیرنگل کو → شوقی بہانے کی

↘

↓

دھیوں کا دیکھ آتا

سک

یعنی: معشوق کا فعل = شوقی اور سک دلی

شوقی → دھیوں کا دیکھ آتا → سیرنگل

سک → دھی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے دونوں اشعار میں نشانیات کا نظام Semiotic System کارفرما ہے۔ استعارہ اپنی جگہ پر موجود ہے (اور اس سے ہم معنی بھی مستخرج کر سکتے ہیں) لیکن نشانیات کا وہ نظام استعارے کا پہلو پہ پہلو اور مساوی سطح پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں (یعنی ان دو شعروں کے نشانیاتی نظام میں) جو و طعص Structures ہیں سب ایک دوسرے کے برابر ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔ مستعار لا اور مستعار منہ میں برابری کا رشتہ نہیں ہوتا۔ یعنی جس چیز سے استعارہ کرتے ہیں وہ اس شے سے بڑی ہوتی ہے جس کے لیے استعارہ کیا جاتا ہے۔ یعنی "زید شیر ہے" میں زید کی قوت بہر حال شیر سے کم ہوگی۔ مثلاً اگر بہاؤری کے لیے استعارہ لانا ہے تو یہ کہنا بے معنی ہے کہ "زید گزریل ہے"، کیوں کہ گزریل کی شہرت اس کی شہامت کے باعث نہیں۔ حالانکہ وہ نہایت قوت مند جانور ہے۔ یہاں لامحالہ "زید شیر ہے" یا "زید جنگلی باقھی ہے" وغیرہ کہنا ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں حسب ذیل شعر ملاحظہ ہو:

چیں زوال آلودہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رکبزار ہاویاں

اس شعر میں مہر گردوں = چراغ ر بگوار ہاں اور چراغ ر بگوار ہاں = مہر گردوں قرار دیا ہے۔ ان کا استعاراتی تعلق انتہا اہم نہیں ہے جتنا اہم ان کا نشانیاتی رد ہوا ہے۔ یعنی جہاں جہاں چراغ ر بگوار ہاں دیکھو اسے مہر گردوں [کی طرح زوال آلودہ] سمجھو۔ چراغ ر بگوار ہاں گویا Sign ہے اور مہر گردوں اس کا Signant دوسری طرف، جہاں جہاں اور جب مہر گردوں کو دیکھو یا اس کا تصور کرو، اس کو چراغ ر بگوار ہاں [کی طرح زوال آلودہ] سمجھو۔ اس شعر کی قوت Sign اور Signant کی نشانیاتی مساوات میں ہے، جب کہ استعارہ اپنے مستعار لہ کا Signifier (مذلول) نہیں ہوتا۔ مستعار ہمہ ہمیشہ مستعار لہ سے افضل اور قوی تر ہوتا ہے۔ نشانیاتی نظام میں Sign اور Signant ایک وحدت قائم کرتے ہیں۔ لہذا جب استعارہ اور نشانیاتی نظام ایک ہو جائیں، جیسا کہ اس شعر میں ہے، تو معنی کی توسیع ہی نہیں، بلکہ معنی کا سراپید ہوتا ہے۔

غالب ہمارے کلاسیکی شاعروں میں واحد شاعر ہیں جن کا مطالعہ اگر خالص مغربی شعریات کی روشنی میں کیا جائے تو بھی وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گا۔ کیوں کہ ان کا ذہن جدید ذہن کے رجحانات کو ہاں ہاں Anticipate کرتا ہے اور اگرچہ وہ کائنات کو مشرقی کلاسیکی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جگہ جگہ اس کے بارے میں استفہام بھی کرتے ہیں اور مروجہ اقدار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ مشرقی شعریات، مشرقی تہذیب اور مشرقی نظریہ کائنات (World View) سے پوری ہمدردی اور واقفیت کے بغیر غالب کا مطالعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ہمارے پہلے بڑے جدید شاعر ہیں اور آخری بڑے کلاسیکی شاعر ہیں۔ غالب کے بارے میں بہت لکھا گیا ہے، لیکن ان کا حق ادا ہونا اس وقت شروع ہو گا جب انھیں کلاسیکی اور جدید دونوں تصورات کی روشنی میں بہ یک وقت پڑھا جائے۔

مطالعات غالب، سبک ہندی اور پیروی مغربی

غالب کے بارے میں دو قصبے مشہور ہیں۔ اطلب، بلکہ چینی ہے کہ دونوں بالکل جھوٹے ہیں۔ لیکن چوں کہ ان سے ہندی تہذیبی روایت، اولیٰ نظر ثانی شعور اور امتداد کے انداز اور تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ لہذا اپنی گفتگو انہیں قسموں سے شروع کرتا ہوں۔ پہلا قصہ یہ ہے کہ جب شیخہ سرتاج میں تھے تو ان کی ملاقات ایک ایرانی سے ہوئی۔ شیخہ چوں کہ فارسی زبان و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے اس لیے ان کی دوستی اس ایرانی سے ہو گئی۔ ایرانی نے ایک بار ان سے پوچھا کہ ان دنوں تمہارے یہاں سب سے اچھا فارسی شاعر کون ہے؟ شیخہ نے بڑے شوق اور جذبہ انکسار کے ساتھ دیوان غالب نکال کر اسے پیش کیا۔ ایرانی نے اسے دوسرا دوسرے الٹا پلٹا، چند شعر پڑھے، پھر منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ یہ شاعری تو سراسر کھل لوہے کی ہے۔ نہ زبان درست ہے نہ معنوں کا پیو۔ شیخہ بے چارے بہت غصہ ہوئے۔ دوسرا قصہ یہ ہے کہ ایک ایرانی نوجوان دہلی میں کسی کتاب فروش کے یہاں دیوان غالب خریدنے کے لیے گیا۔ (ساری گفتگو فارسی میں ہو رہی تھی۔) وہ کہان پر اس وقت اتفاق سے غالب بھی موجود تھے۔ کتاب فروش نے کہا کہ دیوان غالب تو نہیں لیکن فلاں فلاں (مثلاً صاحب، فنی، مرنی) کے دیوان ہیں۔ نوجوان نے کہا ”نہیں مجھے صرف غالب کا دیوان درکار ہے۔ وہ قرم سابق خوب کہتا ہے۔“ کتاب فروش نے مسکرا کر کہا کہ دیوان غالب نہیں، یہاں خود غالب ضرور موجود ہیں اور غالب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نوجوان بے حد اشتیاق کے ساتھ غالب سے ملا، لیکن ذرا شرمندہ بھی تھا کہ میں نے پیادہ سے کسی

لیکن غالب کو ان کے سامنے یوں ان جانے میں قلم ساقی کہا۔ غالب نے کہا ”میں میاں۔ آج مجھے کچی قریف اور قدر دانی ملی ہے۔“

شیفہ والا واقعہ تو غالب کے کسی مخالف نے گڑھا ہے۔ خاص کر ایسا مخالف جو ان کے دعویٰ فارسی کوئی کا منکر ہو۔ قصے کے فرضی ہونے میں بہر حال کوئی شک نہیں۔ اول تو یہی بات مستعد ہے کہ کسی ایرانی ملاقاتی نے شیفہ جیسے شخص سے ایسی توہین آمیز گفتگو کی ہو۔ اور اگر ایسی بات کسی نے کہی بھی تو شیفہ کوئی معمولی شخص نہ تھے وہ فارسی کے عالم اور علوم حد اول سے خوب واقف تھے۔ غالب تو اپنے دیوان میں غزل ہی درج نہ کرتے تھے جو شیفہ کو پسند نہ ہو:

غالب پہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او

نوش در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

شیفہ کے لیے قطعی ممکن تھا کہ وہ اس ایرانی کو سخت جواب دیتے اور قائل معقول کرنے کی کوشش کرتے۔ رہا دوسرا قصہ تو وہ یقیناً شیفہ والے قصے کے جواب میں گڑھا گیا ہے۔ غالب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ کتاب خریدتے ہی نہ تھے، چہ جائے کہ کسی کتاب فروش (اگر کتاب فروشوں کی دکانیں اس زمانے میں ہوتی تھیں) کی دکان پر جا کر بیٹھے رہیں۔

قصے دونوں فرضی سہی، لیکن قصے بلاوجہ نہیں بنتے یا بنائے جاتے۔ کسی تہذیب میں جو قصے اور لطیفے اور حکایات حد اول ہوتے ہیں، وہ اس تہذیب کے تصور کائنات، غلط اور صحیح کے بارے میں اس کے معیارات، اور اس کے معاشرتی ثقافتی اقدار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ (مثلاً اگر معاشرے پر عورتوں کا تسلط ہوتا تو بیوی کی حماقت مآبی، اسراف بے جا، ضد اور متکون مزاجی کے لطیفے اس قدر عام نہ ہوتے اور مغربی معاشرے میں سب سے مقبول لطیفے بیوی کی والدہ کے خلاف نہ ہوتے۔ غالب کے بارے میں ان قصوں کے ذریعے ہم انیسویں صدی کے بدلے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے کے بارے میں بعض اہم نتائج نکال سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی فارسی گو بذات خود مستند نہیں۔ اگر ایرانی کہہ دے کہ ہندوستانی فارسی گو کا کلام مجھے مطبوع طبع نہیں تو ہندوستانی فارسی گو کی وقعت صفر ہو جائے گی اور اگر ہندوستانی فارسی گو کو مستند حاصل کرتا ہے تو اسے ایرانی ہی سے رجوع کرنا ہو گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدر چانچ (وفات ۱۳۳۳) سے لے کر غالب (وفات ۱۸۶۹) تک کی مشفق سخن گوئی اور لونی روایت جو کوئی چھ سو برس کے عرصے کو محیط تھی۔ ہندوستانی شاعر کو وہ اعتبار نہ دلا سکی جو ایرانی کو از خود حاصل تھا۔ یعنی اقتدار و استناد امر ان کا حصہ تھا اور غلطی و بے اعتباری ہندوستان کا مقدر تھی۔ اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ غالب شاعر کس درجے کے اور کس مہارت کے تھے۔ غرض اس بات سے تھی کہ ایرانی ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اسی سے یہ دوسرا نکتہ بھی نکلا ہے کہ ہندی مزاج (چاہے وہ ہندوستانی مسلمان کا ہی مزاج کیوں نہ ہو) اور ایرانی مزاج میں کچھ ایسا بعد المشرقین ہے کہ ایرانی (چاہے وہ یہودی اہل ہب کیوں نہ ہو) فارسی شاعری کا حق ادا کر سکتا ہے، لیکن ہندوستانی اس سے قاصر رہے گا۔ تیسرا نکتہ یہ نکلا ہے کہ ہندوستانی اگر دو لسان (Bilingual) بھی ہو (یعنی اردو اور فارسی دونوں زبانیں مادری زبان کی طرح سمجھتا ہو) کہ ایسا شخص جو فارسی کا محض کتابی ماہر ہو، فارسی محاورے اور زبان کو ”اہل زبان“ کی طرح نہیں برت سکتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوستانی چاہے ساری عمر فارسی پڑھنے لکھنے پر لگے، لیکن وہ فارسی میں ایسے تصرفات کا حق نہیں رکھتا جو ”اہل زبان“ ایرانی بچے بھی روز و شب عمل میں لایا کرتے ہیں۔ اس طرح کے عقائد کا انجام یہ ہوا کہ خود ہندوستانیوں کی نظر میں بیدل، غالب اور اقبال جیسے بڑے شاعروں کی فارسی پایہ ثبوت سے ساقط قرار پائی۔ ”شعر العجم“ جیسی اقتدار دار کتاب میں بیدل کا صرف نام ایک دو جگہ آیا ہے۔ غالب تو اسنے کے بھی مستحق نہ ٹھہرے۔ واقف اور فیض اور بطیم اور برہمن وغیرہ کا تو بچہ پھانسی کیا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا رویے اور صورت حالات ہندوستان میں بہت قدیمی ہیں۔ لیکن درحقیقت معاملہ بالکل مختلف ہے۔ خود ایرانی حضرات کی نظر میں ہندوستانی فارسی گو یوں کی کوئی وقعت نہ ہو (وہ لوگ تو خسرو تک کی زبان میں کیزے نکالتے ہیں جن کے بارے میں غالب کا فیصلہ تھا کہ اہل ہند میں امیر خسرو کے سوا کوئی مسلم المذہب نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں لٹیک نکل جاتی ہے۔) لٹیک نکل جانا = بات غلط ہو جانا۔ لیکن اہل ہند اپنے بارے میں مطمئن تھے کہ فارسی زبان و ادب پر وہ بالکل اہل ایرانیان کی طرح مشغول ہیں اور خان خانان، بیدل، فیض، واقف، ناصر علی سرہندی، خان آرزو،

آرزو بکراہی وغیرہ بھی اسی طرح مستند اور ”ورست“ ہیں جس طرح حاققہ، روئی، سعدی اور ان کے بعد کے سبک بندی والے ایرانی سالانہ ورست ہیں۔ انھارویں صدی میں یہ خیال عام تھا کہ ہندوستانی نزاد فارسی گو اور ایرانی نزاد ہندوستانی فارسی گو (جیسے بیدل، میرزا مظہر، برہمن، باسٹر علی، ظہور علی، اعلیٰ، لوتی، آستخا، خالص، فیضی، سعید اسٹراف، نعمت خاں عالی، غنی) سب کے سب معتبر اور معتد ہیں اور ان کا استعمال سند ہے۔ خان آرزو نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایرانی نزاد لغت نگاروں مثلاً محمد حسین حمیری صاحب ”برہان قاطع“، جمال الدین انجو صاحب ”جہاں گیری“ اور عبدالرشید اقصینی صاحب ”رشیدی“ کے لغات سند رجہ بالا کا حقیقی حاکم کیا اور اس طرح یہ ثابت کیا کہ لغت شامی اور تحقیق الفاظ میں ان ایرانیوں کا اور چہ ہندوستانیوں سے کم ہے۔ پھر انھوں نے شیخ علی حزیں کے کلام میں درجہوں الفاظ لکالے اور اس بحث پر ایک مستقل تصنیف ”حبیبہ الفاظین“ کے نام سے مرتب کی۔ یہ اور بات کہ خان آرزو کے حریف سیالکوٹی مل وارسٹ نے شیخ علی حزیں کے دفاع اور خان آرزو کے رد میں اپنا رسالہ ”رجم الشیاطین“ لکھا، لیکن وہ ذاتی معاملہ تھا۔ ہندوستانیوں کو مستند قرار دینے میں وارسٹ اور خان آرزو ہم خیال تھے اور وارسٹ نے اپنے لغت ”مسطلمات شعرا“ میں متحدہ ہندوستانیوں کے کلام سے بے تکلف استفادہ کیا ہے۔ پھر آئندہ رام تلخیص کی ”مرآۃ الاصطلاح“ ہے۔ اس کے بارے میں نذیر احمد کا خیال ہے کہ انھارویں صدی میں ہندوستانیوں کی لکھی ہوئی کچھ فرہنگیں جن کا جراب اہل ایران آج تک نہ چس کر سکے، ان میں ”مرآۃ الاصطلاح“ نمایاں مقام کی مالک ہے۔ سب سے بڑھ کر ایک چند بہار کی ”بہار نگم“ ہے جسے فارسی الفاظ و محاورات کا سب سے بڑا اور تحمل ترین لغت کہا جاسکتا ہے۔ بہار اور وارسٹ دونوں نے خان آرزو سے استفادہ بھی کیا ہے اور اختلاف بھی اپنے عظیم الشان لغت میں ایک چند بہار نے جگہ جگہ اپنے استاد خیر اللہ مہندس دہلوی کو ”خیر اللہ فقہین“ اور خان آرزو کو ”سراج الفقہین“ کے نام سے یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں بہار نے پرانے ایرانیوں یا ایرانی نزاد لغت ر شرح نگاروں سے بھی اپنی تحقیق کے مطابق اختلاف کیا ہے۔

نقد شعرا کے میدان میں آئے تو شمس الدین فقیر کی ”حدائق البلاغت“ ہے جس میں عروض و بیان اور قافیہ کے بارے میں اجتہادی باتیں ہیں۔ سودا کا رسالہ ”مہرۃ الفاظین“

ہے جس میں انھوں نے فاخر کین کے جواب میں ہندوستانی اور ایرانی شعر کا دفاع کیا ہے اور کین کے اعتراضات کو بخوبی رد کیا ہے۔ انشا اور قنیل کی ”دیباچے لطافت“ ہے جس کو لسانیات پر اردو کی اولین کتاب کہا جاسکتا ہے اور جس میں علم بیان پر بھی گفتگو ہے۔ تخلیق کے میدان میں سرب سکھ دیوانہ جیسے جگت استاد ہیں۔ سودا ہیں جو اردو فارسی میں دو لسان ہیں۔ میر ہیں جو فارسی کے عمدہ شاعر اور اعلیٰ درجے کے فارسی نثر نگار بھی ہیں۔ بھوبت رائے عظیم ہرگی ہیں جنھوں نے دیدانت کے مسائل کو مثنوی رومی کے طرز پر ایک طویل مثنوی میں بیان کیا۔ محمد افضل سرخوش اور آرزو بلکرای اعلیٰ درجے کے مڈکرہ نگار اور غیر معمولی شاعر ہیں۔ خود بیدل ہیں اور پھر ان کے شاگردوں میں بندر امن خوشنود، اجل داس اور سکھراج بہت ہیں۔ فرض کہ اٹھارویں صدی کے بارے میں ہمارے کتابی مواد کچھ بھی نہیں، لیکن فارسی زبان و ادب کے اعتبار سے یہ صدی ہندوستانی خود اعتمادی کے قائم ہونے اور ہندوستان میں فارسی زبان شناسی، لغت نگاری اور فارسی میں تحقیقی کام کے سن بلوغ کو پہنچنے کی صدی ہے۔

تخلیق، تحقیق اور خود اعتمادی کے اس جوش کے بعد انیسویں صدی کے ہندوستانی فارسی حلقوں میں اعتماد کی کمی، ہندوستانی فارسی گوہوں کی ناقدری اور فارسی کے عمومی زوال کی صورت عبرت انگیز اور حیرت نگر ہے۔ فارسی زبان و ادب زوال کی ایک وجہ تو انگریز قرار دیئے جاسکتے ہیں جنھوں نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کو سرکاری زبان کے مرتبے سے ہٹا دیا۔ لیکن ہندوستانی فارسی کے بارے میں رائے کی آپ وہاں میں تبدیلی کے لیے وجہ تلاش کرنا آسان نہیں۔

ایک حد تک تو خود غالب اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ ہوا اکل عمر سے لے کر ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۹ء تک وہ بیدل کی گرویدگی کا اعلان بار بار کرتے رہے، اردو میں زیادہ اور فارسی میں کم۔ لیکن فارسی میں عملاً انھوں نے بیدل پرستی کا اظہار یوں کیا کہ بیدل کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اپنی مثنوی ”چرخ و دہر“ انھوں نے صاف صاف بیدل کے تتبع میں لکھی اور غالب ملا سابق ہمدی کی مثنوی ”ناشر عشق“ بھی ان کے سامنے تھی۔ (ملا سابق ہمدی دیار اصدا مشرق کے مشہور استاد، فارسی گو اور شیخ علی حزیں کے دوستوں میں تھے۔) طوطا

رہے کہ ”پہلو دیے“ یا تو ہمارے کے زمانہ قیام کی یادگار ہے، یعنی جب غالب نکلتے جاتے ہوئے ہمارے میں ٹھہرے تھے، یا پھر نکلتے میں اپنی آمد کے فوراً بعد انہوں نے یہ مثنوی لکھی۔ ہندوستانی فارسی گوئیوں سے غالب کی عقیدت کے مبدل پہ ندرت و استحقاق ہونے کی وجہ مرزا قنیل تھے جن کی سند پر ایک صاحب نے غالب کے شعر میں ”ہند عالم“ کی ترکیب کو غلط ٹھہرایا تھا:

جزوے از عالم و از ہند عالم بیستم

ہم چوموسے کہ تباں را زمیاں بر خیزد

غالب نے کسی بنا پر محض قنیل سے انکار کرنا ٹھیک نہ سمجھا اور مصلحت اسی میں جانی کہ تمام ہندوستانی فارسی گوئیوں کے منکر ہو جائیں۔ ممکن ہے محفل میں (یا نکلتے میں) قنیل کے ماننے والوں کی تعداد بہت کثیر دیکھ کر غالب نے محض قنیل کو اپنے انکار کا دھڑ بھٹانا خلاف احتیاط سمجھا ہو۔ بہر حال مثنوی ”ہند و خالف“ میں پھر بھی وہ بیدل کا لحاظ کر رکھتے اور ان کو واقف اور قنیل کے ساتھ نہ رکھا:

ہم چناں آں محیط ہے ساحل

مکرم فیض، میرزا بیدل

☆☆☆

گرچہ بیدل ز اہل ایوان نیست

لیک ہم چوں قنیل ہواں نیست

☆☆☆

مگر آہاں کہ پارسی دانند

ہم بریں عہد و رای و پائند

کہ ز اہل زباں نبود قنیل

ہرگز از اصنافاں نبود قنیل

لاجرم اعتماد را نسزد

مکتبہ اش استناد را نسزد

خمن است آشکار و پنهان نیست
دلی و لکھو و ابراہن نیست
☆☆☆

اے تماشایانِ ژرف نگاہ
ہاں بگوئید حسیۃً للہ
کہ چان از حزیں بہ حکم سر
آہ بہ جادو دی بہ دہر سر
☆☆☆

دامن از کف کسم چکو نہ رہا
طالب و عرفی و نظیری را
خاسر روح و روان معنی را
آں ظہوری جہان معنی را
☆☆☆

آں کہ طے کردہ اہی موافق را
چہ محاسن قلیل و واقف را

غالب نے یہاں تو بیدل کو رہائی نہیں دے کر پاس کر دیا اور باقی ہندوستانیوں کو صاف راستہ بتا دیا کہ دلی اور لکھو ”نرا ابراہن نیست“ لیکن بیدل کو قائم رکھنا اور باقی ہندوستانیوں کو ساقط رکھنا خلاف عقل تھا، لہذا انھوں نے اس مشغولی کے بعد کہیں نظم و نثر میں بیدل کی تعریف نہ کی۔ اپنے خطوط میں ایک آدھ بار بیدل کے شعر انھوں نے ضرور نقل کیے، لیکن ان کی فارسی کو مستند بنانا، مدح پر ایل ۱۵۵۵ء کے ایک خط میں عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں: ”ناصر علی اور بیدل اور فیست ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھیے ہاتھ کلکٹن کو آرسی کیا۔“ ”رہے ہندوستانی لغت نویس یا ایرانی نثر اور ہندوستانی لغت نویس، تو ان کے بارے میں غالب نے کچھ بھی نہ لکھا رکھی۔ وہ تو صاحب تک بعض اوقات اس بنا پر مستزاد کر دیتے ہیں کہ ”صاحب اگرچہ استغنائی نثر و تھا مگر وار و شاہ جہاں آباد تھا، انتظام کشیدن و انتظام

گر فتح دونوں بول گیا۔ ”(ایضاً بنام عبدالغفور۔) ”دراستہ سہ لکھائی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوچکر اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ ہاں اسے وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔“ (ایضاً بنام عبدالغفور۔) پھر لکھتے ہیں: ”فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نکلائی و سحدی و طبرہ کی لکھی ہوئی تو فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت مانیں۔“ (بنام تفتہ مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۵ء) اس کے باوجود جہاں انھیں من مانی کرنا ہوتی ہے، وہاں غالب امیر انہوں کو بھی نہیں بخشے۔ صاحب کا حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ”بے خبر“ کے بارے میں تفتہ کو لکھتے ہیں (قبل ۱۸۶۳ء): ”لفظ بے خبر تو درانی بچہ ہائے ہندی نڈو کا تراشا ہوا ہے۔۔۔ مرزا اجال امیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے ہاندھے ہوئے لفظ کو لفظ کہوں۔ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ کا یہ ان ایسا لفظ لکھے۔“ یعنی ”امیر زادہ غایبان“ لکھ بھی یہ حق نہیں کہ کسی ایسے لفظ کو برت لے جو ہندیوں نے تراشا ہو۔ ہندیوں کا تراشا ہوا لفظ یا فقرہ گندہ ہی ہو گا۔ زبان کے حرکی محل سے بے خبری جو غالب کے اس بیان سے حشر ہے، اس پر مزید گفتگو بے کار ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اصل زبان ہی کیا جو ضرورت اور موافقہ کے لحاظ سے الفاظ یا فقرے نہ وضع کر سکے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے الفاظ یا فقروں کو استعمال کرنے سے قاصر رہے؟

ایک دو اقتباسات اور ملاحظہ ہوں۔ (بنام تفتہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۱ء): ”میں ”برہان“ کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ ”چار شریعت“ اور ”فیث اللغات“ کو حیض کاٹا سمجھتا ہوں۔“ (بنام مرزا رحیم بیگ) ”یہ کیا بات ہے کہ جامع ”برہان“ کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہاں گیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شجی اور میاں انجوس کیا بیری ہے؟ قلب شاد جہاں گیر کے عہد میں ہوتا کر فطاسے برتری ہے تو بے چارہ جعفر زلفی بھی فرخ سیری ہے۔“ پھر ”برہان قاطع“ کے قصبے میں انھوں نے مسلسل اس بات کا اعادہ کیا کہ اصل ہند کی فارسی بے وقعت ہے (اور ظاہر ہے کہ ”اصل ہند“ سے ان کی مراد وہ لوگ بھی تھے جو اپنی اصل تھے لیکن ہندوستان میں وہ بس کھے تھے اور جنھوں نے فارسی زبان کی بعض بہت قابل قسم فرہنگیں مرتب کی تھیں۔ مثلاً محمد حسین حمیری، جمال الدین انجو شیرازی، ا۔ ی۔ الرشید، حسینی الدینی اتھوی (۱)

”قاطع برہان“ کے رد میں سب سے مفصل اور مقتدر کتاب جو کسی مکی وہ آغا احمد علی کی ”موید برہان“ (۱۸۶۹ء) تھی۔ چار سو سے زیادہ صفحات کی اس کتاب کے جواب میں غالب نے رسالہ ”تنقیز“ لکھا جو بہ مشکل ساٹھ صفحے کا ہے۔ اس میں مصطفیٰ خاں شیخزادہ اور حالی جیسے شاگردوں اور نیاز مندوں کے بعض اقوال بھی درج ہوئے فتویٰ درج کیے۔ یعنی ایک طرف تو خان آرزو کو غیر مستند کہا جا رہا ہے۔ جمال الدین انجو اور محمد حسین حمیری کو پایہ اعتبار سے ساقط قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اسی سانس میں خود اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کا قول بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے تضادات اور الغلط کے باوجود غالب ہی کی ہمت جلی اور احمد علی کے اعتراضات اور استدراکات بے حقیقت رہے۔ یعنی ہندوستانیوں نے اپنی جڑ آپ ہی کاٹ دی اور اپنی ہی زبان سے خود کو غیر مستند اور غیر معتبر قرار دے لیا۔ آغا احمد علی کی کتاب کا اثر، بلکہ نام تک، نہ پہلنے کی ایک وجہ حالی کا بیان بھی ہے۔ ”یادگار غالب“ میں حالی نے اس بات کا ذکر بالکل نہ کیا کہ غالب نے ”تنقیز“ میں انھیں بھی مفتی بنایا تھا۔ بلکہ اپنے عام مسلک کے خلاف حالی نے تمام مویدین ”برہان قاطع“ (اور جالین غالب) کے بارے میں تحقیری جملہ استعمال کیا: ”ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت سمجھ سی حالت میں ہیں، ان کے لیے کج غول و گم نامی سے لکھنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربراہ آور وہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔“

موجودہ معلومات کی روشنی میں یہ کہنا تو مناسب نہ ہو گا کہ انیسویں صدی میں ہندوستانی فارسی گوؤں کی اعتبار شکنی، صرف اور صرف غالب کی وجہ سے (یعنی غالب کی رایوں اور فیصلوں کے باعث) عمل میں آئی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۶۹ء یعنی دم آخر تک غالب نے ہندوستانی فارسی گوؤں کو غیر معتبر اور غیر مستند قرار دینے کی صم چلائی۔ چالیس برس میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو بھینچا ہیڈ ہو گا۔ شبلی کی مثال ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے ”شعرا انجم“ میں غالب اور بیدل کا کوئی ذکر نہ کیا، تاہم سرخوش و

واقف و سرب سکہ و بوند و غیر ہم چہ رسد۔ ایک پار شیلی کو لفظ ”انداز“ کے بارے میں حقیقی بات مطلوب تھی، تو ایک صاحب نے انھیں غالب کے ایک شعر کی طرف متوجہ کیا جس میں یہ لفظ آیا تھا۔ شیلی نے جواب میں لکھا کہ غالب کا شعر ان کی نظر میں تھا، لیکن غالب جوں کہ ”اہل زبان“ نہیں ہیں، اس لیے ان کے استعمال سے تعقیفی نہیں ہوئی۔ مولانا شبیا احمد بدایونی نے ساجیہ اکاڈمی کے لیے فارسی شاعری کا ایک انتخاب ”سمن زار“ کے نام سے مرتب کیا۔ (اول اشاعت ۱۹۶۸ء) یہ انتخاب اب بھی بہت با اثر اور مقبول ہے۔ اس میں غالب تو ہیں لیکن تبدیل، غنی، واقف، میرزا مظہر کسی کا پتہ نہیں۔

شیلی اور غالب کے مقابلے میں ہم اہل لکھنؤ اور اقبال کو پیش کر سکتے ہیں کہ لکھنؤ والوں (بلکہ عام اردو والوں کو) اقبال کو مستعد بنانے میں ہمیشہ تامل رہا ہے۔ سرور صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک بار لکھنؤ میں بحث اٹھی کہ ”آویزش“ بمعنی ”بھگڑا، اختلاف“ صحیح ہے کہ نہیں۔ سرور صاحب نے فوراً اقبال کا شعر پڑھا: ”ہاں جبریل“، ”لکھنؤ بیٹوں“ ”چور و مرید“:

تاکجا آویزش دین و وطن

جوہر جاں پر مقدم ہے بدن

تو سراج لکھنوی مرحوم نے فرمایا کہ اقبال مستعد نہیں ہیں، کسی ”اہل زبان“ کا شعر سنا ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کو نقصان ضرور پہنچایا، لیکن ہندوستانی فارسی گوئی کی قدر شکنی میں ان کا ہاتھ نہیں نظر آتا۔ بلکہ انگریزوں نے تو ہندوستانی راہبرانی کا فرق بظاہر بالکل نہیں کیا۔ انھوں نے ہندوستانی فارسی گوئوں کی شاگردی اختیار کی، انھیں کی طرح شعر گوئی کی۔ ۱۸۰۳ء تا ۱۸۰۵ء میں ہندوستان میں فارسی کا آخری بڑا لغت (”شس اللغات“) ایک انگریز جوزف جینر (Joseph Jenner) کی فرمائش پر بعض ہندوستانی علما نے تیار کیا۔ انیسویں صدی میں ”برہان کا طبع“ کی کم سے کم چار اشاعتیں عمل میں آئیں۔ ان میں سے دو اشاعتیں انگریزوں کے زیر اہتمام تھیں۔ فضل علی نائی ایک شخص نے ۱۸۸۵ء میں ایک فارسی انگریزی لغت شائع کیا اور اس کے ویسا پتے میں لکھا کہ ”مہربان برطانوی حکومت“ کے زیر سایہ انگریزوں میں فارسی کا ذوق بڑھ رہا ہے، و غیرہ۔ انگریزوں نے فارسی سے انگریزی میں ترجمے کو فروغ دیا۔ یعنی انگریزوں نے ہندوستانی فارسی ادب کو قائم و مقبول

کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر کام نہ کیا ہو، لیکن انھوں نے ہندوستانی فارسی گویش کو ہندوستانی فارسی ادب کے بارے میں کسی احساس کمتری میں نہ مبتلا کیا۔

بعاد ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سیاسی صورت حال تھوڑی بہت اور ہندوستان میں انگریزوں کی ثقافتی صورت حال بہت کچھ بدلی۔ اب انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین ربا کم ہونے لگا۔ ہندوستانی (خاص کر ہند + مسلم) ادب و ثقافت کے خلاف انگریزوں کا قہصیب بڑھنے لگا۔ ہندوستانی طرز معاشرت انگریزوں کی محل سراں میں کم سے کم دکھائی دیتے۔ چند ہی برسوں میں بالکل معدوم ہو گیا۔ لیکن اس سب میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں سے کہا ہو کہ تمہارا فارسی شعر و ادب پڑھنے پڑھانے کے قابل نہیں ہے، اصل فارسی تو ایرانیوں کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خود ہندوستانیوں کے دل میں اپنے خلاف نفرت اور اپنی اقتدار کے بارے میں شک و شبہ کا دور جو ۱۸۵۷ء کے بعد زور و شور سے شروع ہوا ("آپ حیات" کو ہند + مسلم Self Hatred کا اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے) اس کی بنا پر ہندوستانیوں کو اپنا فارسی ادب بھی ایرانیوں کے مقابلے میں لچر اور کم وقعت معلوم ہونے لگا ہو تو اور بات ہے۔ تاریخ ہمیں بس اتنا بتاتی ہے کہ فارسی تو فارسی۔ اردو میں بھی فارسی روزمرہ اور اسلوب کی صحت اور درستی کا التزام جو ہمیں اٹھارویں صدی میں بالکل نہیں ملتا۔ انیسویں صدی میں اچانک ہر طرف نظر آنے لگتا ہے۔ لوگ فارسی تراکیب کی سند مانگنا شروع کر دیتے ہیں، اس بات پر بحث کرنے لگتے ہیں کہ فلاں لفظ فارسی میں فلاں معنی میں ہے یا فلاں طرح بولا جاتا ہے۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ عروض اور قافیہ میں جو آدھریاں اٹھارویں صدی میں عام تھیں، انیسویں صدی کے اردو والے انھیں یک قلم ترک کر دیتے ہیں، بلکہ اپنی طرف سے بھی دس میں پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ غالب نے لکھا کہ جب کسی مصرعے میں الف گرتا ہے تو میرے سینے پر چھرا سا گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حضرت شاہ آسی سکندر پوری (۱۸۳۳ تا ۱۹۱۷ء) اس بات پر فخر کرتے تھے کہ میرے پارے کلام میں کہیں بھی الف دہلایا ساقد نہیں ہوا ہے۔ "فارسی" الفاظ میں حرف علت کا سقوط بطور خاص جرم ٹھہرایا جانے لگا۔ میر عشق اور ان کے پیروں نے تو "کہاتے ہیں"، "جانتے ہیں"، "کہاتی ہیں"، "جاتی ہیں" وغیرہ فقرہوں کو بھی پروذن فاعلن لکھنا اپنے اوپر حرام قرار

وے لیا۔

یہ چیزیں کسی کائناتی بیانے کے احساس کم تری اور خود نظریتی کی بنا پر پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن خود اس احساس کم تری کا ہندوستانی بہ مقابل ایرانی فارسی کی بحث کا روپ لے لینا بھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر حال اس کا فوری نتیجہ غالباً یہ ہوا کہ ہندوستانی فارسی گو یوں میں سے اکثر کو ترک کر کے چند ایک، خاص کر غالب، پر توجہ ہوئی اس امید میں کہ زبان کے بجائے مضمون اور ”فکر“ کے پہلوئوں کو آگے بڑھائیں تو شاید غالب کو بین الاقوامی محفلوں میں بار مل سکتا ہے۔ چنانچہ ”بادگار غالب“ اور ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں کچھ اس قسم کا نظریہ قائم کیا کہ اگرچہ فارسی محاورہ اور لفظیات کے التزام میں غالب کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، بلکہ عام طور پر عربی، نظیری، غزوری وغیرہ سے بڑھ کر ہی ہیں، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ:۔ غالب کے یہاں ”اصلیت اور جو ش“ کی فروانی ہے، یعنی ان کی شاعری ”پچی“ ہے۔ روایتی اور دو فارسی شاعری کی طرح ”صوٹ“ اور ”مہالے“ پر مبنی نہیں ہے۔ غالب کے یہاں فکر اور ”تفصیل کا نکات“ (یہ اصطلاح حالی کی ہے) کا عنصر نمایاں ہے۔ ۳۔ غالب کو روایت کا احترام ہے، لیکن وہ اندھے روایت پرست نہیں ہیں، بلکہ اپنی راہ آپ نکالنا پسند کرتے ہیں۔

یہ تینوں کی تینوں باتیں بیسویں صدی کے شروع میں نقد غالب کا وظیفہ رہیں (اور کتابی تنقید میں آج بھی نمایاں ہیں)۔ حالی کی اس بات کو تو کسی نے نہ مانا کہ غالب کی فارسی ”نعل زبان“ مور ایرانیوں کے ہم پلہ ہے، لیکن ان کی یہ بات بہت چلی کہ غالب کا تذکرہ مغربی شعرا کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مغربی طرز تنقید سے غالب کو جان نہیں تو غالب کا پلہ ہلکا نظر نہ آئے گا اور غالب کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ”مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی معیارے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے۔ مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کون سی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے، اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔“ (”بادگار غالب“، اڈل ایڈیشن ۱۸۹۶ء صفحہ ۳۲۸)

بہر طور، حالی نے ہندوستانی فارسی گو یوں اور خاص کر غالب کی تنقید کو ایرانیان پرستی کے اس قلاوے سے نہایت دلائی جو انیسویں صدی سے اور خود غالب سے انھیں ورثے میں ملا

تھا۔ امیران کے علی الرغم، انھوں نے تنقید اور خاص کر نقد غالب کا رخ مغرب کی طرف پھیر دیا۔ اس کے نتائج بہت جلد سامنے آئے۔ عام طور پر لوگ بجنوری اور حالی میں بڑا بعد زمانی فرض کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ”محاسن کلام غالب“ (۱۹۳۱ء اور ”یادگار غالب“ (۱۸۹۹ء) میں پچیس سال کا بھی فرق نہیں۔ اس سے خاصا زیادہ فرق آل احمد سرور کی ”نئے اور پرانے چراغ“ (۱۹۵۹ء) اور محمد حسن عسکری کی ”جدیدیت۔ یعنی مغرب کی گمراہیوں کا خاکہ“ (۱۹۷۹ء) میں ہے۔ ”بجنوری نے حالی کے اصولوں اور اشاروں پر چلتے ہوئے ایسی تنقید لکھ دی جو بعض اعتبارات سے ”یادگار غالب“ سے بھی زیادہ بااثر ثابت ہوئی۔ ”محاسن“ میں حسب ذیل قسم کے جملے قدم قدم پر ملتے ہیں:

صلاح الدین خدا بخش نے غالب کا مقابلہ ہاشم رشیدی (۱) نے المانوی شاعر سے کیا ہے۔ کہاں ہاشم رشیدی نے محض معنی..... کہاں غالب جو دنیا کو اطلس (۲) کی مثال اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ (ص ۷۳)

غالب اور کیلے دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔۔۔۔۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ (ص ۷۳-۳۸)

ہنسیگر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے۔ (ص ۳۵)

طیپیان (۳) (Titian) کے رنگوں میں بھی وہیں سکون ہے جو اس کی جنبش مو قلم میں ہے اور گائین (۴) (Gauguin) کے رنگوں میں

- (۱) تخلص اور الما بجنوری مرحوم کے مطابق ہیں۔ آج کل اردو میں ہائٹنرنگ ہائٹنر مستعمل ہے۔
- (۲) Atlas یونانی اسطور میں ایک دیو (Titan) جسے آسمان بردوش رہنے کی سزا ملی تھی۔ پرومیتھیوس Prometheus (جس نے دنیا کو آگ سے روشناس کیا) اس کا بھائی تھا۔
- (۳) اصل تخلص لیٹن ہے۔ میں نے بجنوری مرحوم کے تخلص اور الما کی پابندی کی ہے۔
- (۴) اصل تخلص گوگین ہے۔ میں نے بجنوری مرحوم کے تخلص اور الما کی پابندی کی ہے۔

بھی وہی پہچان ہے جو ارتعاش اس کے تحفیل میں ہے۔ مرزا نے خود
آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا
ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے
اور ہزار بار کہے سنے ہوئے ہیں۔ (۱) (ص ۷۳)

حالی اور بجنوری کی قائم کردہ غالب کی نئی تنقید سے غالب اور کلاسیکی اردو فارسی
شاعری کو جہاں بہت سے نقصان ہوئے وہاں کئی فائدے بھی ہوئے۔ سب سے پہلا فائدہ تو
یہ ہوا کہ غالب کو مغربی شاعر کی طرح پڑھا جانے لگا اور ان کے سوانح بیدل و عمرنی و
طالب آملی سے زیادہ گونجے، ورڈزور تھ اور شکسپیر سے ہونے لگے۔ یعنی غالب کو مغربی
ایوان میں بشمار دیکھنا ممکن ہو سکا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ مغربی طالب علموں اور ماہرین کو
ہوا جن کے لیے کلاسیکی پارادائی طرح کا مطالعہ بے سود، یا نامعلوم یا بہت مشکل تھا۔ پھر یہی
ہات اردو فارسی کے ہندوستانی طالب علموں اور نقادوں پر صادق آنے لگی نہ یعنی غالب
ہمارے لیے ہندوستانی شاعر بھی رہے اور مغربی شاعر بھی بن گئے۔ فلسفہ محکم غالب، غالب
کی شاعری میں خودداری، خود پسندی، علو ہمتی، بلند حوصلگی، غالب اور انسان دوستی وغیرہ
موضوعات کا چلن ہو اور غالب کو سمجھنے کے لیے کسی داخلی، اندرونی نقاد سے *Insider's*
View کی ضرورت نہ رہی۔ بالفاظ دیگر مغربی ماہرین اور علما جن کے لیے غالب کو سمجھنا عام
حالات میں بہت مشکل ہوتا، اب غالب کے بارے میں آسانی سے کلام کرنے لگے۔ غالب
اور اہل غالب کا اس میں یہ فائدہ تھا کہ غالب کے بارے میں غور و فکر کرنے کے نئے طریقے
اور نئے راستے ہاتھ آئے اور غالب کی عقلیت کا ایک اور ثبوت ملا۔ پھر لطف یہ کہ اس بحث
میں پڑنے کی ضرورت نہ رہی کہ غالب کی کون کون سی ترکیب اور استعداد اور فقرے
ایرانی فارسی کے معیار پر کمرے اترتے ہیں۔ عام طور پر ہندوستانی فارسی کو کاہلار تو سر د کا
سرور ہا، لیکن غالب کا نرخ ان اجناس کی بنا پر اونچا ٹھہرا جو مغربی طراز کے مطالعے کی بنا پر
لوگوں نے ان کے یہاں دریافت کی تھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حالی اور بجنوری کے بغیر
غالب کو وہ شہرت ملی جو انھیں ملی۔ وہ یقیناً اس شہرت، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ غلام مک، پس ماندہ اور شکست خوردہ تہذیب اور احساس کمتری سے پہلی ہوئی ادبی قوم میں از خود یہ جرأت نہ پیدا ہوتی کہ وہ غالب کو دنیا کے بڑے شاعروں کی صف میں بشمارے۔ یہ درست ہے کہ غالب کے کلام میں بیسویں صدی کی پیش آمد بہت ہے، لہذا یہ زمانہ انھیں اپنوں ہی میں سے سمجھتا ہے۔ لیکن غالب کے یہاں بیسویں صدی کے ذہن یا جدید ذہن کی دریافت تو حالی اور بجنوری نے ہی کی تھی۔

غالب نے اپنی چھوٹی چھوٹی خود نوشتیں جو دو تین جگہ لکھی ہیں ان سے قطع نظر کریں تو ”یادگار غالب“ ان کی پہلی سوانح حیات ہے۔ اس کے بارے میں حالی نے آخر کتاب میں صاف لکھ دیا تھا کہ یہ اقتضا سے طبیعت اور جوش محبت کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ لہذا لازمی تھا کہ ”یادگار“ میں غالب کے کردار و کوائف کے وہ پہلو کم سے کم نمایاں کیے جائیں جن سے غالب کی شخصیت پر کسی قسم کی ضرب پڑتی ہو۔ بعد میں یگانہ نے رباعیوں اور مختصر نثری تحریروں کے ذریعہ غالب کو برا بھلا کہنے میں کچھ کمی نہ کی، لیکن ان کی تحریر میں ذاتی تعصب اور احساس کمتری کا حیزاب زیادہ تھا، تنقید کا آب زلال کم۔ مغربی انداز کو شعوری طور پر اختیار کرنے والوں میں ڈاکٹر عبداللطیف سرفہرست ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب Ghalib: a Critical appreciation of his life and Urdu verse (مطبوعہ ۱۹۴۸ء) میں غالب پر سخت کٹہہ چھینی کی، لیکن ان کے یہاں مغربی انداز سے زیادہ مغرب زدہ احساس کمتری نظر آتا ہے۔ غلام رسول مہر (اول ایڈیشن ۱۹۳۶ء) نے غلط توصیف کا انداز اختیار کیا۔ لیکن چوں کہ انھوں نے غالب کے اردو فارسی خطوط سے خوب استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کی سوانح عمری کا رنگ بھی مغربی رنگ سے قریب ہے۔ مہر نے حالی کی ایک دو غلطیاں بھی دہی زبان سے گنوائی ہیں۔ لیکن بقول شیخ محمد اکرام ”شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرز تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متعلق ہوں گے کہ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے قریب قریب نا ملید تھا، یعنی حالی۔“ (۱)

شیخ محمد اکرام کی ”آثار غالب“ پہلے ”غالب نامہ“ کے نام سے ۱۹۳۶ء میں چھپی اور

۱۹۳۹ء میں ”آثار غالب“ کے نام سے نئی شکل میں نئی کتاب کے روپ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا ذیلی عنوان ہے: ”مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زندگی اور تصانیف کا تفصیلی مطالعہ، جدید علم نفسیات اور فن تحقیق کی روشنی میں۔“ آج جس قسم کی سوانح عمریاں مغرب میں لکھی جا رہی ہیں (بعض لوگ انھیں Psychobiography کہتے ہیں) اور ان میں جس طرح صاحب سوانح کے ذاتی (اکثر ناگفتنی) کمالات کربلا کرید کر لکھے جاتے ہیں، ان کے سامنے ”آثار غالب“ بہت سیدھی سادی اور بے رنگ، لیکن اپنے زمانے کی اکثر انگریزی سوانح عمریوں سے بھی زیادہ صاف گو ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

شیخ اکرام اور ان کے بعد خورشید الاسلام اور رالف رسل کی وسیع و عریض Ghaliab Life and Letters (اول ایڈیشن ۱۹۶۹ء) میں یہ کم زوری مشترک ہے کہ تینوں حضرات کلاسیکی غزل کی شمریات سے بڑی حد تک نااہل ہیں۔ لہذا ان کے لیے شاعری اور سوانح میں فرق کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ رسل اور اسلام کا انداز تحقیق ہے اور شیخ اکرام نہیں کہیں سر بیان لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں روپے ایک حد تک مغربی طرز فکر کا نتیجہ ہیں۔ رسل اور اسلام کا انداز فکر غالباً یہ ہے کہ ہم یہ سوانح حیات غالب کے خطوط کی روشنی میں مرتب کر رہے ہیں اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اردو سے بالکل یا کم و بیش ناواقف ہیں۔ لہذا اس میں ایسی باتیں نہ ہوں گی جو خطوں سے مستحکم نہ ہو سکیں اور ایسی باتیں بھی نہ ہوں گی جو کسی تنازعہ کو روک لیں۔ رسل اور اسلام نے غالب کی شاعری کے بارے میں الگ سے ایک کتاب لکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ ابھی تک شرمندہ تعبیل نہیں ہوا ہے۔ زیر بحث کتاب میں غالب کی شاعری یا نثر پر کوئی اکتہار خیال نہیں۔ شیخ اکرام نے غالب کی ”نچرل شاعری“ کے بارے میں لکھا ہے: ”ان کے ہاں نیچر فقط ایک دلچسپ شاعرانہ موضوع ہے۔۔۔۔۔۔ مرزا کو نیچر سے وہ دلہانہ دل بٹھکی نہ تھی جو دروازہ در تھو تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں، نیچرل شاعری کی نشوونما ایک شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔“ (۱) یعنی غالب بے چارے شہری آدمی تھے، انھیں دیہات اور صحرا اور جنگل سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ نام نہاد ”نچرل شاعری“ کا غالب کے یہاں فقدان

در اصل شعر کی نوعیت اور ماہیت کے بارے میں مغرب سے مختلف خیالات و اصول کے باعث ہے نہ کہ ان کے ”شہری“ ہونے کے باعث۔

غالب کی ”عشقیت“ شاعری کے بارے میں شیخ صاحب کا خیال ہے کہ زیادہ تر اشعار میں ”محبت کی خیالی اور رسمی تصویریں“ ہیں۔ ”ان اشعار میں غالب کی زندگی کے شخصی واقعات یا محبت کے متعلق اس کا خاص نقطہ نظر نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ یہ اشعار ذہنی مشق کی مثالیں ہیں۔۔۔ یہ اشعار کسی عجم نفسیاتی حقیقت یا فکلی واردات کا اظہار نہیں۔“ (۱) یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ غالب جس شعریات کے بحر و اور پابند تھے اس میں نفسیاتی حقیقت یا شخصی واقعات یا فکلی واردات کی وغیرہ کا بیان کوئی خاص ماہیت نہ رکھتا تھا۔ غالب کی ”عشقیت“ شاعری ہائزن کی شاعری نہ تھی جس کے بارے میں ہائزن نے لکھا ہے کہ ”شاعری تحلیل کا پگھلا ہوا مادہ ہے جس کے پھٹ پڑنے سے زلزلے کا سدباب ہو جاتا ہے۔“ (۲) اور نہ یہ دروزور جھ کی شاعری تھی جس کے بارے میں دروزور تھ کا خیال تھا کہ ”شاعری وہ جذبات ہیں جنہیں ہم عالم سکون میں دوبارہ اپنے حافظے میں مجتمع کرتے ہیں۔“ (۳) شیخ اکرام نے ”جدید فن تنقید“ سے انگریزی کی رومانی تنقید مراد لی، جنہاں ایسی غلطیاں یا غلط فہمیاں لازمی تھیں۔

مثالاً پری گارتا کی روسی تصنیف ”مرزا غالب“ کا نہایت سلیس اور دلکش اردو ترجمہ (از اسامہ فاروقی) ہم ماہنامہ ”سب رس“ حیدر آباد میں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے دلچسپی کی حامل ہے۔ اڈل تو یہ کہ روسی زبان میں یہ غالب کی پہلی مفصل سوانح عمری ہے۔ دوسری غیر ملکی زبانوں میں جو سوانح عمریاں ہیں (مثلاً رسل اور خورشید اسلام کی (Ghalib: life and letters) وہ پری گارتا کی کتاب کے مقابلے میں ذرا محدود ہیں، کیوں کہ پری گارتا نے اپنی کتاب میں نفسیاتی، سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو بھی پیش

(۱) مرزا غالب، صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۶

(۲) خطبات مسٹل بینک (Miss Millbanke) سورہ ۱۰، جنوری ۱۸۱۲ء

(۳) ریاچہ، Lyrical Ballads (دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۰ء) عام طور پر یہ مضمون Poet and

Poetic Diction کے نام سے معروف ہے۔

کیا ہے۔ انھیں غالب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی شیخ اکرام، رسل اور خورشید اسلام کو ہے (بلکہ پری گارن کی عقیدت ان لوگوں سے شاید کچھ بڑھ کر ہی ہوگی۔) پھر بھی انھوں نے غالب کی عیب پوشی کی ہے نہ عیب جوئی، بلکہ سب معاملات کو سیدھے سچے طور پر اپنے نقطہ نظر سے بیان کر دیا ہے۔ ہر کسی طرز فکر اور مکتب خیال کی پروردہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے تاریخ کے سلسلے میں ہر کسی مصطفیٰ مثلاً کنور محمد اشرف اور خود ہر کس سے خوش چینی کی ہے، لیکن وہ ان کی اندھی تقلید نہیں ہیں۔

ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ مثالی پری گارن کلاسیکی اردو فارسی کی شعریات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ شاعری تہذیب کا اظہار ہوتی ہے نہ کہ سماجی حالات کا مثلیتی خود کار انعکاس۔ واضح رہے کہ جدید ہر کسی نقادوں، خاص کر لوسین گولڈمان Lucien Goldman نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ ادب میں سماجی حالات کا مثلیتی، خود کار انعکاس ہوتا ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے یہاں کے ”ترقی پسند“ نقاد اس مفروضے کے سیدھے معلوم ہوتے ہیں۔ (پری گارن کو اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ ہمارے یہاں قلم جدید معاشرے میں شاعر کا مقام یہ تھا کہ وہ معاشرے کا ایک کار آمد فرد تھا اور اس کا کام تھا شعر کہنا۔ (۱) لہذا شاعری مناعت تھی اور شاعر مناعت۔) ”مناعت“ بمعنی اہل حرفہ یا پروفیشنل نہیں، جیسا کہ محمد حسن مجھے ہیں، بلکہ بمعنی باہر فضاں۔ شاعر چوں کہ لفظوں کا کام کرتا تھا اس لیے اس کے یہاں مہارت اور ہنرمندی میں حکمت اور عقل بھی شامل ہوتی تھی۔ لہذا اگر شاعر قصیدہ لکھ رہا ہے تو وہ جموت کا کاروبار نہیں کر رہا ہے اور نہ ایسا کوئی ”ہنپاک“ دفتر ”تیار“ کر رہا ہے جو ”مخوفت“ میں سنڈاس سے بدتر ہے۔ وہ محض اپنی مہارت اور حکمت کا اظہار کر رہا ہے، تاکہ وہ روزی کما سکے اور دنیا پر اپنے کمال کا سکھ بٹھا سکے۔ پری گارن کہتے ہیں (باب ۱۳):

”ماتر جاگیر دار لڑے سماج کے تاریخی حالات میں اور اس سماجی نظام کے
آورشوں اور معیارات اور ادب کی نسبت سے روایت کے مطابق

(۱) جس کے برخلاف، روایتی سودیت نظام میں بہت سے شاعر اس لیے قتل یا سبیر یا بھیج دیے جاتے تھے کہ وہ کوئی مقام ”نہ کرتے تھے۔

کیے جانے والے نقادوں کو ملحوظ خاطر رکھیں تو یہ نقطہ نظر بالکل فطری تھا۔ (یعنی ”کوبی مشاغل“ سے حاصل ہونے والی کمائی کے بارے میں علمی اور غیر رومانی نقطہ نظر) کوبی پیٹے کی ایک نوع کے طور سے قصائد کے ذریعے رقم کا حصول روایت کے مطابق ایک قابل قبول امر سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اس بنیاد پر پادشاہوں کے لیے تاج بنانے والے ستاروں اور زر و دوزی کے کام کے چوٹے سینے والے ورزیوں پر بھی..... گھنچا پڑنا ساز کی کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔“

جس طرح کلاسیکی اردو غزل کی شعریات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی پہلی کوشش اس غزل کے پاس داروں اور درگا نے نہیں، بلکہ ایک غیر ملکی (اطالوی) ماہر ہسپانہ رویو سانی (Alessandro Bousani ۱۹۳۱ تا ۱۹۸۸) نے کی (ملاحظہ ہوں ”اردو غزل“ اور ”غزل“ پر اس کے مضامین جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں) اسی طرح قصیدے کے بارے میں یہ حقیقت اردو دانوں نے نہیں بلکہ پری گارٹا نے سب سے پہلے بیان کی ہے کہ قصیدہ جموٹ کی پوٹ اور ذہنی و روحانی و اچالہ پن کا مظہر نہیں تھا بلکہ ایک فن تھا، ایک ماہر اند اور پیشہ ورانہ کارروائی تھی، جس کے اپنے آداب و اصول تھے۔

مجھے پری گارٹا سے یہ ضرور کہنا ہے کہ کلاسیکی اردو (فارسی قصیدہ اور غزل کی تکنیکی قوت ”جاگیر دارانہ سلج“ کے آؤرشوں اور معیارات اور تاریخی حالات میں نہیں بلکہ ہند + مسلم اور عرب + ایران تصور کائنات میں تلاش کی جانی چاہیے اور شاعر کامرتہ شخص سلائی بنائی کرنے والے کاری گر کا نہیں بلکہ لفظوں کے ذریعے ”تکنت“ بیان کرنے والے اور ”سمال“ ظاہر کرنے والے کا ہونا چاہیے۔ یوں درسا کی کتاب Ghalib: The man, the times (۱۹۸۹) میں شاعر کے مرتبے کے بارے میں مربیانہ یا اختصاریت پسند (Reductionist) نظریے کا اظہار نہیں ہے اور اس حد تک وہ کتاب قابل قدر ہے۔ لیکن کلاسیکی اردو شعریات کے بارے میں درسا کی معلومات پوسٹ حسین اور رسل اور اسلام سے بھی کم ہیں۔ پھر وہ فارسی سے نا بلند ہیں۔ ان کے برخلاف پری گارٹا کو فارسی کا اچھا علم اور ذوق ہے اور انھوں نے غالب کی نظم و نثر فارسی سے خوب کام لیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ”شاعری کچھ نہیں ہے صرف مصنف کے سوانح حیات یا داخلی کوائف ہیں“ کا اصول جس نے رسل اور اسلام کی کتاب Three Mughal Poets کو قرب کیا ہے اور جو بیسویں صدی کے ادراک سے ہمارے یہاں رائج ہوا، مغرب کی رومانی اور سوانحی تنقید کا ایسا اصول ہے جسے ہم لوگوں نے بہت اختصاریت پسندی (Reductionism) کے ساتھ برتا۔ یہ اصول اب مغرب والے بھی ترک کر چکے ہیں۔ لیکن اردو میں اس کا چلن اب بھی باقی ہے۔ بجنوری کے یہاں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور اکرام نے بھی اسے خوب برتا ہے۔ پری گارتا بھی اس کی اسیر معلوم ہوتی ہیں، اگرچہ یہاں ان کا سرچشمہ اردو کے نقاد نہیں، بلکہ مارکسی + رومانی تنقید ہے۔ اس اصول کو بے عذاب برتنے کے باعث ہمارے اردو والے غالب کی غزل:

قلبت کدے میں میرے شبِ خم کا جوش ہے

کو ۱۸۵۷ء کی جلی پر مرثیہ بتاتے رہے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ غزل ۱۸۴۱ء کی ہے جب انقلاب ۱۸۵۷ء کا نام و نشان نہ تھا تو ہم لوگ یہ کہنے لگے کہ شاعر کی چشمِ داخل میں نے ۱۸۵۷ء کا منظر ۱۸۴۱ء میں دیکھ لیا تھا! یا پھر یہ کہ ۱۸۵۷ء نہ سہی ۱۸۴۱ء سہی، لیکن جلی و برہادی تو میر کے زمانے سے موجود تھی!!

غالب کی غزل:

ورگر یہ از بس ناز کی رخ ماندہ بر خاکش نگر

و آں سینہ سودن از تپش بر خاک نم تا کش نگر

کے بارے میں پری گارتا کہتی ہیں (باب ۱۳) کہ یہ غزل:

غالب نے اس بے جاوت کے زمانے ہی میں لکھی ہے۔ غزل میں ایک

ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی رتبہ اور تو نگر تھی، اور

اب اس کے اطلاس کے دن آگئے ہیں۔ اسے ناقابل یقین لذتیں

برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ اس غزل میں واقعات کی طرف واضح

اشارے تو شاید نہیں ملتے، لیکن اپنے مضمون کے اعتبار سے اسے

غالب کی غزلوں میں کلیہ استثنائی مقام حاصل ہے۔

یہاں پہلی گزرتی ہے کہ یہ غزل ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان فارسی میں شامل ہے۔ لہذا اس کا کوئی تعلق بعناوت ۱۸۵۷ء سے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ محضر مجاز کا ترجمہ جو اصل متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، حسب معمول خوب ہے لیکن غزل کے صرف چھ شعر درج ہیں۔ روسی سے واقف ہونے کی بنا پر میں یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں کہ غالباً پری گارنا نے بھی چھ ہی شعر دیئے ہیں یا پھر وہی دس شعر کی غزل کا ترجمہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے چھ ہی شعروں پر اکتفا کی گئی ہے۔ اگر دس کے دس شعر سامنے ہوں تو پری گارنا کا یہ دعویٰ بڑی حد تک غلط ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں ”ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی اور تو نگر اور اب اس کے افلاس کے دن آگئے ہیں“ وغیرہ۔ تیسری بات یہ کہ غالب نے اپنی غزل نظیری کے جواب میں لکھی ہے۔ نظیری کا مطلع ہے:

چشمِ برا ہے ی رود مژگانِ خمِ ناش گھر

در سینہ دارو آتشِ بیزامن چاکش گھر

سات شعر کی یہ غزل بڑی حد تک مسلسل ہے اور اس کا مضمون عموماً طور پر یہ ہے کہ معشوق اب کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے اور جس شخص پر وہ عاشق ہوا ہے وہ نظیری (یعنی مظلوم) نہ کہ محمد حسین نظیری (فیثا پوری شاعر) خود ہے:

وحشی غزالے کز حیارم در بیاہاں ی خورو

رام نظیری ی شود در ہوش وادرا کش گھر

غالب کی غزل میں بھی ایسی بات ہے کہ معشوق کو کسی اور پر عاشق دکھایا ہے۔ جو چار شعر پری گارنا کی کتاب میں محذوف ہیں، ان میں سے دو شعر حسب ذیل ہیں:

بر مقدم صید افسیکے گوشے بر آوازش نہیں

در بازگشت تو سنے چشمے بہ فترا کش گھر

بر آستان دیکرے در شکر در ہانش نہیں

در کوئے لالہ کد کم ترے در دھک خاشاکش گھر

بر سبیل تذکرہ عرض کردوں کہ غالب کا ”خاشاکش گھر“ والا شعر نظیری کی تقریباً پوری غزل پر بھاری ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس غزل میں کہیں سے بھی اس عورت کی

تصور نہیں آتی جس کا ذکر پری گارنا نے کیا ہے۔ اشعار کو لغوی بیانات سمجھنے کے قیام باع
انہوں نے ایک اور جگہ غالب کے شعر:

اس جفا شرب پہ عاشق ہوں کہ مجھے ہے اسد

دل سنی کو مہاج اور خون صوفی کو حلال

سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی ”ستم پیشہ دوستی“ شیعہ تھی یا تشیع کی طرف
ماں تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی ”الٹی بخش حاکم احمد خاں“ کی کسی تحریر کا حوالہ دیا
ہے۔ میرا خیال ہے اہل غالب میں شاید ہی کوئی ”الٹی بخش حاکم احمد خاں“ یا ان کی تحریر کو جانتا
ہو۔ (مجھے تو یہ نام بھی غلط معلوم ہوتا ہے۔) بہر حال پری گارنا خود لکھتی ہیں کہ الٹی بخش کی
روایتیں قابل اعتبار نہیں اور ”یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعے کا ماخذ محض یہ شعر ہو۔“
(باب ۵)

جب شیعہ دوست یا طوائف کے وجود کے بارے میں شواہد کیا کسی قسم کی مذہبی گپ بھی
ہم تک نہیں پہنچی ہے، تو کیا پری گارنا کو زیادہ احتیاط لازم تھی۔ لیکن وہ الٹی بخش کے بیان
کردہ قصے سے اتنی متاثر ہو گئیں کہ انہوں نے شعر کو شاید کے طور پر استعمال کیا اور پھر اس
شہادت سے انکار بھی کیا، لیکن لکھ دیا کہ ”ایک بات البتہ صاف ہے، وہ دل فریب تھی اور
قیاس غالب یہ ہے کہ وہ مذہم ذات کی معمولی ”بت پرست“، کافر اور ”بے دین“ لڑکی تھی اور
مرزا اس کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کے لیے تیار تھے۔“ اس دعوے کی دلیل وہ اس طرح کا
شعر پیش کرتی ہیں (باب ۵):

آخر کار گرفتار سر زلف ہوا

دل دیوانہ کہ دارستہ ہر مذہب تھا

غزل کی رسومات اور غزل گوئی کے شرائط کو نظر انداز کر کے اسے مغربی طرز کی lyric
فرض کرنے کے یہی نتائج ہوتے ہیں۔

تاکید پری گارنا کی کتاب کے سب سے عمدہ حصے وہ ہیں جہاں انہوں نے سبک بندی،
خیال بندی، اور تجزیہ استعارہ و دیگر سے مملو شاعری سے بحث کی ہے۔ یہاں انہوں نے
اردو کے نگاروں (مثلاً غور شید الاسلام کی کتاب ”غالب: ابتدائی دور“) اور حالی سے کسب

فیض کیا ہے۔ غالب کے اسلوب کا شجرہ بیان کرنے میں انھوں نے روسی حیثیت پسندوں کا اصول بھی پیش نظر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں (باب ۳):

مرزا غالب کی ابتدائی شاعری متحدہ دہلوی ادوار کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے، جن میں ابتدائی مغلیہ عہد کی سولہویں صدی کی فارسی شاعری، آخری مغلیہ عہد کی سترہویں اور ابتدائی افشارویں صدی کی فارسی شاعری اور اسی طرح سے بشمول سیر افشارویں صدی کی اردو شاعری شامل ہے۔ افشارویں صدی کے انتقام اور انیسویں صدی کے آغا زکی اردو شاعری کی اس بڑھی کے شاعر اس میں شامل نہیں ہیں جو شاعری میں غالب کے قریب ترین حلقہ میں آیا "آبا" کے زمرے میں ہیں۔ لیکن دنیائے شاعری میں آبا و اخیال کے درمیان سلسلہ ارتقا عام طور سے اتنا استوار نہیں ہوتا جتنا چچا بھٹیوں کے درمیان۔ "آبا" کے زمرے سے اپنی شاعری کے اس دور میں غالب نے صرف ایک ناصح کو چنا۔ اردو شاعری میں اپنے "مجد لو" کے زمرے سے انھوں نے سیر، انشا اور سودا کا انتخاب کیا۔ لیکن بنیادی توجہ انھوں نے "سبک بندی" کے فارسی گو شاعروں بیہل، صاحب، فنی کا خمیری اور شوکت بخاری یعنی ان شاعروں کو دی جن کے مرزا "پر پوتے" لگتے ہیں، کیوں کہ جیسا کہ روسی شاعر لوسپ مندیشنام نے کہا ہے "بہت سے ایسے خوانے ہیں جن سے پوتے محروم رہ جاتے ہیں اور ان پر تصرف پر پوتوں کا ہوتا ہے۔"

تالیما پر ی مگردانے غالب کے شجرہ شاعری میں انشا، سودا اور ناصح کو شامل کر کے غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ مندیشنام کا اقتباس اور چچا بھٹیوں والا لکتہ (جو براہ راست اشکلا و سگی سے مستعار ہے) پر ی گارہ کی اصول سازی میں روسی حیثیت پسندوں کے اثر کی نشان دہی کرتا ہے۔ میں مندرجہ بالا اقتباس پر اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ غالب کی صرف ابتدائی شاعری نہیں، تمام شاعری میں وہی اثرات نظر آتے ہیں جن کا ذکر پر ی گارہ

نے اوپر کیا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ دیباچے کے نام پر دو تین صفحات کلمہ کر فرض سے لوانا ہو جہاں لیکن پری گارنا کی کتاب میں اسنے مسائل اور اسنے پہلو سمٹ آتے ہیں کہ خود میرے خیالات کو مہمیز لگی اور میں دیباچے کے نام پر دو دور دور کے کچی کوچوں میں بھٹکتا پھرا۔ پری گارنا نے اردو فارسی کا مطالعہ محض رکی یا محدود سطح پر نہیں کیا ہے۔ ان کا ثقافتی اور لسانی شعور بھی محدود و غور و فکر اور سبک بندی کی شاعری سے فطری مناسبت کے ذریعے پروان چڑھا ہے۔ ان کی معلومات وسیع اور تعقبات بہت کم ہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ روسی زبان میں یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی، یعنی اس زمانے میں جب روسی محکمت میں اعلیٰ درجہ کی وہ آڑوئی نہ تھی جو آج ہے۔ اس کے باوجود پری گارنا کی کتاب روایتی روسی سوویت مفروضات سے آزاد ہے۔ غالب کی ذمہ داری ایک کم و بیش بے رنگ ذمہ کی تھی۔ ۱۸۵۵ء کے سولاس میں کوئی عظیم، کوئی متعدد آمیز واقعہ، کوئی روح فرسا لیلیہ نظر نہیں آتا۔ نکلنے کا طویل سفر انھوں نے ضرور کیا تھا، مگر اس کے بعد ان کا چشمہ حیات کسی اہم موڑ سے آشنا نہ ہوا۔ اس نہایت غیر دلچسپ ذمہ داری کو پری گارنا کے بیابانے نے دلچسپ اور دلکش بنادیا ہے۔

عمر اسامہ فاروقی کا ترجمہ عام طور پر رواں اور پڑھنے میں آسان ہے۔ اس کے پہلے وہ خدوم محی الدین کی حیات اور شاعری کے بارے میں اکیسی سو غانچیف (Alexei Sokhachev) کی کتاب کا ترجمہ دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ (مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد ۱۹۹۳ء) خدوم کے مقابلے میں غالب پر کتاب کا ترجمہ زیادہ صبر آزما کام تھا۔ اسامہ فاروقی نے نمایاں پری گارنا کے تعاون سے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔ پری گارنا نے فارسی اردو کے اقتباسات روسی زبان میں خود ترجمہ کر کے شامل کتاب کیے تھے۔ ان تمام کی اصل تلاش کر کے انھیں بچھڑا (یا اردو ترجمے میں) درج کیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غالب کے فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ بھی (مترجم مضطر مجاز) اکثر و بیشتر شامل کر لیا گیا ہے۔ ترجمہ تقریباً ہر جگہ کامیاب اور درست ہے اور کتاب کی افادیت بڑھا رہا ہے۔

پون ورمائی کتاب کی طرح پری گارنا کی کتاب بھی غالب کی تہذیب اور ثقافت کو اندر سے دیکھنے اور پھر وہاں سے غالب کی حیات و کائنات کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ (یہ الگ

بات ہے کہ چون ورسا کو فارسی نہیں آتی، لیکن اردو انھوں نے صرف غالب سے دلچسپی کے باعث سن بلوچ کو پہنچنے کے بہت بعد سیکھی۔ (اردو والے غالب پر آج تک ایسی کوئی کتاب سمجھنے پہنچا سکے یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سوانح غالب کا ایک پہلو اور مالک رام

جناب مالک رام کے بارے میں اعلیٰ خیال کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں اسے ادا کرنے سے گریزاں رہا ہوں۔ جب کسی شخص کی ذات اور کارنامہ اس طرح تھوڑے ہوں کہ دونوں میں فرق نہ ہو سکے اور جب اس شخص سے آپ کے مراسم بھی ہوں اور وہ آپ کا بزرگ بھی ہو، تو اس کے بارے میں قلم اٹھانا خوش گواری فریضے کے بجائے روح فرسا امتحان بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے مالک رام صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ مجملہ اور چیزوں کے دواہر غالبیات بھی ہیں اور غالب سے مجھے بھی دور کی نسبت ہے۔ نئے زمانے کی روشنی سے تھوڑا بہت فیض یاب ہونے کے باعث میں دین بزرگوں خوش نہ کردن کو صاحب نظر ہونے کی دلیل بھی جانتا ہوں۔ لہذا میں مالک رام سے اختلاف ضرور رکھتا ہوں اور اس اختلاف کے برخلاف ہمارے ذرا تا بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکاد کا یاد اس پانچ جگہ اختلاف کرنے سے مالک رام صاحب کا حق نہیں دیا جاتا۔ کیوں کہ اختلاف یا اتفاق کی کوئی بھی نکتہ یہ ہے کہ وہ کتنی ہی بلند آہنگ کیوں نہ ہو، اس پورے شخص کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی جس کا نام مالک رام ہے۔ میں خود کو تنقید نگار سمجھتا ہوں اور مرتب کتاب نے مجھ سے اس مضمون کا تقاضا شاید اسی لیے کیا ہے کہ وہ بھی مجھے تنقید نگار سمجھتے ہیں۔ لہذا میرا کام تحریر کے حسن و قبح کو واضح کرنا اور ممکن ہو تو اس کے جھوٹ بچ کو الگ کرنا ہے۔ شخصیت نگاری میرا کام نہیں۔ لیکن مالک رام ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں لکھنا اور جن کی تحریر کے بارے میں لکھنا دونوں مجھے ایک نظر آتے ہیں۔ اس مختصر سے غیر رسمی دیباچے کے بعد میں برسر مطلب آتا ہوں۔

غالب کے سوانح حیات کے ایک پہلو پر مالک رام صاحب کی دو تحریروں پر تصورِ اہمیت
 اظہار خیال کر کے میں ان کی غالب شناسی سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتا، لیکن ان کی غالب
 شناسی، بلکہ ان کی محققانہ شان کی نوعیت ضرور ظاہر کر سکتا ہوں۔ محقق کسے کہتے ہیں؟ اس
 سوال کا جواب آسان ہے، لیکن محقق بننا آسان نہیں۔ ظاہر ہے کہ تحقیق کے عام یا معمول
 لوازم مثلاً پس منظر، معلومات، محنت، تلاش، احتیاط، شواہد کو پرکھنے اور ان کا کھرا کھوا مالک
 کرنے کی صلاحیت، یہ چیزیں تو کم و بیش مشق اور مشقت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اعلیٰ درجے
 کا حافظہ جیسا کہ شیر ملنی یا قاضی عبدالودود کو نصیب تھا، وہ سب کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن
 ان سب سے بڑھ کر ایک شے ہے، جسے میں موضوع کی روح میں ہمدردانہ ہمہریت کے
 ساتھ اتر جانے کی صلاحیت کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر محقق
 اور اس کا موضوع میں تو خود مومن شدی کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے طرز فکر
 اور طرز احساس میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے محقق کے لیے اپنے موضوع کا کوئی راز
 سر بہتہ نہیں رہ جاتا۔ وہ فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ یہ شخص کہاں جھوٹ بول رہا ہے اور کہاں
 سچ؟ کسی موقع پر اس شخص کا عمل یا رد عمل کیسا ہو گا، اس کا اسے (یعنی محقق کو) جلیبی یا فطری
 احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایسا محقق اپنے موضوع کو اس طرح زندہ کر دیتا
 ہے کہ آپ محقق کی تحریر پڑھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود اس شخص سے مل لیے جو
 اس کی تحقیق کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا محقق، اشخاص ہی کو موضوع بحث بناتا ہے۔
 اور ایسا تحریکات سے اس کو اس قدر شگفتہ نہیں ہوتا۔ مغربی ادب میں اس طرح کے محقق کی
 پہلی مثال جان لوئنگسٹن لوز John Liningsstone Lowes ہے جس نے آج سے
 کوئی ساٹھ برس پہلے (۱۸۹۲ء) کو لریج کی دو اہم نظموں کے تقریباً ہر جیکر، ہر تشبیہ اور ہر
 استعارے کی اصل اور ان کے مآخذ کا سراغ لگایا۔ ہمارے زمانے میں جوائنس (Joyce) اور
 یے ٹس (Yeats) پر رچرڈ الیمین Richard Ellman اور طارے پر والیس فاگلی
 Wallace Fowlie اس کی مثالیں ہیں۔ اردو کی طرف دیکھیے تو مسعود حسن رضوی شریف
 اور انیس اور واجد علی شاہ، امتیاز علی عرشی اور غالب اور مالک رام اور غالب ایسے محقق کے اعلیٰ
 نمونے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ایسا محقق غلطی نہیں کرتا۔ لیکن یہ غلطی اس طرح کی نہیں ہوتی کہ کسی کتاب کا نام کسی واقعے کی تاریخ غلط درج ہو جائے۔ اعلیٰ درجے کا محقق، جسے وجدانی محقق کہا جاسکتا ہے، غلطیاں بھی وجدانی ہی قسم کی کرتا ہے۔ یعنی اس سے تعبیر و تشریح کی غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ غلطی اسی طرح کی ہوتی ہے کہ جیسے آپ کسی شخص سے بخوبی واقف ہوں، لیکن اس کی کسی بات یا اس کے کسی کام کا غلط مطلب نکال لیں۔ تعبیر و تشریح کی ایسی غلطی اگر بنیادی اور مرکزی حیثیت نہ رکھتی ہو تو اس سے آپ کی فہم اور اس شخص کے بارے میں آپ کے علم کی صداقت پر چنداں حرف نہیں آتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ گویا پریم چند کے ہولوں میں مشرقی یوپی کے بارے میں بعض تفصیلات غلط ہیں، لیکن ان کے باوجود مشرقی یوپی کی روح کے بارے میں ہم جتنا ان ہولوں کے ذریعہ جان سکتے ہیں، اتنا تاریخوں سے نہیں جان سکتے اور نہ مجنوں گورکھپوری کے ہولوں سے ہی جان سکتے ہیں، جن میں تفصیلات تو صحیح ہیں، لیکن مشرقی یوپی کی روح نہیں ہے۔

اس کی مثال مالک رام کے ایک پرانے مضمون ”میرزا غالب، حالات، عادات، خصائل“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (یہ مضمون ”فسانہ غالب“ میں شامل نہیں ہے۔ اگر میرا مشورہ شامل ہو تا تو میں اسے ”فسانہ غالب“ میں سرفہرست رکھتا۔ یہ مضمون ایک فرضی شخصیت کی طرف سے واحد حکلم کے سینے میں ہے۔ حکلم نے غالب کے ”چشم دید“ حالات لکھے ہیں۔ حکلم کی شخصیت فرضی ہونے کے باوجود غالب کی شخصیت اور مزاج کی جو تصویر اس مضمون سے بنتی ہے وہ ہزاروں محققوں کی باریک بیانیوں پر بھاری ہے۔) اس مضمون کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ غالب اپنے بچپن کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ یہ ان کی اور حکلم کی پہلی ملاقات ہے۔ (۱۸۵۲ء):

”میں نے باقاعدہ طور پر مکتب چلا اور پڑھنا لکھنا دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خاں صاحب (یعنی خواجہ غلام حسین خاں کسیدانہ میرزا صاحب کے دادا جان) بہت غصا ہوئے۔ والدہ بھی بہت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی کبھلا۔ لیکن بیکار۔ معلوم نہیں میرے سر پر آوارگی کا بھوت کچھ ایسی بری طرح سوار

تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منہ نہیں کیا۔
(پھر مسکرا کر کہنے لگے) اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی
نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا تاکہ
لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے اس
سے کیا حاصل ہو گا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی بک بک سے:

کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر پاتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے کچھ اپنے آپ
سے جب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا۔ بھائی کو سلام شوق کے بعد

کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے، اور یہ شعر سنایا:

’مالذت دیدار ز پیغام مگر فتنم

مشتاق تو دیدن ز شنیدن گناسد

اور دیکھو، اب کے جو دلی آنا تو میرے ہی پاس ٹھہرتا۔ اس میں تکلف
کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنی گھر سمجھو۔

(”حوال غالب“، مرتبہ مختار الدین آرزو، ص ۹۲)

اس ساری عبارت میں صرف ایک واقعی بات ہے، اور وہ بھی غیر قطعی۔ یعنی یہ کہ
غالب نے بہت نو عمری ہی میں تعلیم ترک کر دی تھی۔ نو عمری کا تعین ”دس بارہ برس کی عمر“
سے کیا گیا ہے، جو غیر قطعی ہے اور عین ممکن ہے کہ پوری طرح درست بھی نہ ہو، کیوں کہ
خود مالک رام کی اپنی ”توقیت غالب“ (مشمولہ، ”عیار غالب“ ۱۹۶۹ء اور ”فسانہ غالب“
۱۹۷۷ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی تعلیم بارہ برس کی عمر تک جاری رہی۔ لیکن اس
کے باوجود غالب کا شخص اس عبارت کے ذریعہ جس خوبی سے ہوتا ہے، وہ اس سوال کے
جواب سے ممکن نہیں کہ غالب نے جب تعلیم ترک کی تو ان کی عمر کے سال کے مہینے تھے؟
عبارت کے الفاظ، لب و لہجہ، غالب کے آثار و ماسوں کا ذکر، تعلیم اور عرض ہنر کی بے فائدگی
کی بات، خاص کر یہ بات کہ پڑھتے لکھتے تو عالم یا مولوی ہی تو کہلاتے، غالب کے ایک اردو
مصرعے اور ایک فارسی شعر کا بر محل حوالہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری تقریر میں الفاظ

کی نشست اور لہجہ، یہ چیزیں غالب کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں اور ان کے ذریعہ غالب کے بارے میں ہماری معلومات علم کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مالک رام کے اس چارے مضمون میں وہی شان ہے جو آندریے موروا (Andre' Maurois) کی ان سوانح عمریوں میں ہے جن میں اس نے بعض انگریز اور فرانسیسی لہجوں کے حالات، ناول کے طرز پر لکھے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں، پھر یہ تحقیق کیا ہوتی، یہ تو ایک طرح کی افلاک نگاری ہوتی۔ (شاید مالک رام صاحب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے یہ مضمون اپنے مجموعے ”فائدہ غالب“ میں شامل نہیں کیا۔) بات صحیح ہے۔ اگر آپ تحقیق کے معنی یہی لیتے ہیں کہ فلاں شعر کی فلاں قرأت فلاں مخطوطے میں ہے اور فلاں مخطوطہ مصنف کا دیکھا ہوا ہے اور مصنف جب (مثلاً) ہوشیار پور پہنچا تو اس وقت شام کے ساڑھے سات نہیں بلکہ سوا چھ بجے تھے تو مالک رام کا یہ مضمون یقیناً محققانہ نہیں ہے۔ لیکن اگر محقق کا یہ بھی منصب ہے (اور یقیناً ہے) کہ وہ جس شخص یا زمانے کے بارے میں لکھ رہا ہے اس کو ہمارے سامنے زندہ کر دے تو یہ مضمون اعلیٰ درجے کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ جھگڑا تو طے ہو نہیں سکتا کہ ترک تعلیم کے وقت غالب کی صحیح عمر کیا تھی، لہذا اس پر وقت کو غیر ضروری طور پر ضائع کرنے سے بھی بہتر ہے کہ غالب کی شخصیت کا تعین کرنے میں سعی کی جائے۔

لیکن ”فائدہ غالب“ تحقیقی کتاب ہے اور غالب کی تعلیم کا ذکر جمل لکھا ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل ناولی مضمون کو چھوڑ کر غالب اور عبدالصمد کے قصبے پر مالک رام کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے۔

اس مضمون میں انہوں نے قاضی عبدالودود جیسے شخص کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے۔ مالک رام نے یہ مضمون قاضی عبدالودود کے جواب میں لکھا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مضمون کے جواب میں اپنے اصل مضمون میں بعض حواشی اور استدراکات کا اضافہ کیا۔ مالک رام صاحب کا مضمون جس شکل میں ”فائدہ غالب“ میں شامل ہے، وہ قاضی صاحب مرحوم کے حواشی اور استدراکات کو نظر میں رکھنے کے بعد تیار ہوئی ہے، لہذا ذرا بحث مضمون کو ہم اس مسئلے پر مالک رام کی کھل اور پوری طرح سوجھی سمجھی رائے کہہ سکتے ہیں۔

قاضی صاحب مرحوم اور مالک رام کے دلائل کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مالک رام صاحب کے یہاں طرف داری کا تصور ابھرتا رہا ہے، لیکن قاضی عبدالودود کم و بیش یہ فیصلہ کر کے چلے ہیں کہ غالب نے چوں کہ بہت سے معاملات میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، اس لیے عبدالصمد کے بارے میں بھی غالب کے بیانات کو مشکوک ہی سمجھنا چاہیے۔ قاضی صاحب مرحوم کا یہ اصول ہندوستانی قانون شہادت Indian Evidence Act پر مبنی ہے، لیکن انھوں نے غالب کے معاملے پر اس کا اطلاق جس شدت سے کیا ہے، اتنی شدت شاید خود قانون شہادت کا مقتضائے تھی۔ بہر حال، قاضی صاحب نے ایک بات ایسی کہی ہے جو اس بارے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ (بشرطے کہ وہ بات صحیح ثابت ہو جائے۔) قاضی صاحب فرماتے ہیں: ("احوال غالب" صفحہ ۲۶۹) "میں مقالہ ہذا کی فصل ۵ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بحث کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں، اس کی صفات سے جدا نہیں کی جاسکتی۔" قاضی صاحب کا یہ ارشاد مبہم ہے، لیکن اس کے معنی (جو پورے مضمون کو پڑھ کر اور قاضی صاحب کی خاصی ابھی ہوئی عبارت سے الجھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں) یہ ہیں کہ عبدالصمد کے وجود کا فرضی یا اصلی ہو یا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کے بارے میں کس طرح کی باتیں غالب نے بیان کی ہیں اور غالب کی تحریروں کو پڑھ کر عبدالصمد کی لیاقت علمی و لسانی کے بارے میں کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالصمد کے صفات اور غالب کے صفات میں ایسا توافقی ہے جس سے اندازہ ہو تا ہے کہ غالب نے اپنی شخصیت پر قیاس کر کے عبدالصمد کی تخلیق کی تھی۔ ایران قدیم کے بارے میں غالب کی معلومات بہت کم ہیں۔ اگر غالب نے واقعی کسی ایسے شخص سے تعلیم حاصل کی ہو تو جو علوم فارسیہ کا ماہر تھا، تو یہ بات نہ ہوتی۔ قاضی عبدالودود کہتے ہیں:

"سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ایران قدیم سے متعلق غالب کے معلومات بہت قلیل تھے اور جو کچھ تھے وہ بھی بہت کچھ غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جس کے معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں۔ ان اصحاب کے لیے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زبوں شنی مذہب سے کسی حد تک بھی ناخبر ہیں، ایک ایسے

دردِ مثنوی عالم کے وجود کا قائل ہو تا جو مرشدین کی جگہ ”مناشیقین“ کو
 صحیح سمجھتا اور ”مجنون“ کو مستحق شانسا ہو، ممکن نہیں۔“

عجب ہے کہ مالکِ دہم نے اپنے ذہنی اعتراض کا جواب باقاعدہ نہیں دیا ہے۔ وہ یہ ضرور کہتے
 ہیں:

”..... ہم غالب کے سوا اور فلسفی کے لیے استاد کو کیسے ذمہ دار ٹھہرا
 سکتے ہیں؟ اور اگر غالب نے ٹھیک روایت کی تھی اور واقعی استاد نے
 انھیں جو کچھ سکھایا تھا وہ آج علم کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں لڑتا تو ہم اس
 سے استاد کے وجود سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں؟ اس صورت میں
 صحیح طریقہ یہ ہو گا کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ استاد واقعتاً ناقابل یا عالم
 قاضی نہیں تھا، جتنا اس کا شاگرد بتا رہا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ
 کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتلایا وہ غلط تھا..... لیکن اس
 سے آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا
 اور شاگرد نے اپنے دل سے یہ بات گڑھ لی تھی۔“

مالکِ دہم نے جو منطقی اصول متعین کیا ہے (غالب کا سوا علمی استاد کے عدم وجود پر دال
 نہیں ہو سکتا) وہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔ اس کی بنیاد ایک ہمہ گیر قصبے پر ہے اور اس کا اطلاقی
 علمی حقیق و تحقیق کے کئی میدانوں میں ہو سکتا ہے۔ عجب ہے کہ قاضی صاحب جیسا متفکر
 اور منطقی اس کو نظر انداز کر گیا۔ اگر غالب نے کچھ غلط باتیں عبد الصمد سے منسوب کی ہیں تو
 اس کا منطقی نتیجہ یہ نہیں ہے کہ عبد الصمد قاضی نہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ تین شقوں میں بیان
 ہو سکتا ہے: ۱۔ غالب جھوٹ بول رہے ہیں، ان کے استاد نے انھیں وہ باتیں نہیں سکھائی
 تھیں۔ انھیں سند کی تلاش ہے، لہذا انھوں نے وہ باتیں عبد الصمد سے منسوب کر دیں۔
 ۲۔ غالب کو سمجھا رہا ہے، عبد الصمد نے یہ باتیں ان کو نہیں سکھائی تھیں۔ سو عبد الصمد نے
 غالب کو غلط تعلیم دی تھی۔ لہذا عبد الصمد کا عدم وجود غالب کے سوا پر مبنی قرار نہیں دیا
 جاسکتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ غالب کی کم علمی (جیسا کہ قاضی صاحب کا دعویٰ ہے)
 عبد الصمد کے وجود کے بارے میں غلوک ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ قاضی صاحب کا ارشاد ہے،

کہ امیر ابن قدیم کے بارے میں غالب کی معلومات بہت محدود ہیں اور جو ہیں بھی وہ محدود ہیں۔ اگر غالب نے عبدالصمد جیسے کسی شخص کی شاکردی کی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔

مالک رام صاحب اس باب میں خاموش ہیں، لیکن ایسا نہیں کہ یہ اعتراض بالکل مسکت ہو۔ اس کا جواب، بلکہ اس کے کئی جواب ممکن ہیں۔ مالک رام نے حالی کی شہادت کو بنیادی قرار دیتے ہوئے قاضی عبدالودود کی بعض باتوں کو لائق اعتناء نہیں سمجھا ہے۔ لیکن ان کا جواب اسی وقت مکمل دہ لیں کہا جائے گا جب وہ قاضی صاحب کے تمام نکات کو قرار واقعی طور پر رد کریں۔ لیکن قاضی صاحب نے بعض جگہ غلط بحث سے کام لیا ہے اور مالک رام نے اس کی وضاحت بڑی خوبی سے کی ہے۔ مثلاً قاضی صاحب نے یہ اصول بہت صحیح قائم کیا ہے کہ ”عبدالصمد اگر وجود خارجی رکھتا تو غالب اس کے شاگرد ہوتے تو اس سے کچھ نتائج مرتب ہوتے۔“ لیکن اس سے ان کا یہ استدلال کہ یہ نتائج غالب کی شاعری پر عبدالصمد کے امیرانی ہم عصریوں کے اسلوب کا اثر اور عبدالصمد کے زمانے کے ”مخصوص امیرانی“ محاوروں اور روزمرہ کلام کے کلام میں وجود کی شکل میں ظاہر ہوتے، محل نظر ہے۔ موجودہ زمانے میں ہزاروں لوگوں نے امریکہ یا انگلستان میں برسوں تعلیم پائی ہے، لیکن ان کی تحریر و تقریر پر اپنے زمانے کی امریکی یا انگلستانی بولی اور اسلوب ادب کا اثر یکساں نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ اثر نہ ہونے کے برابر ہے، بعض لوگوں میں معتد بہ ہے۔ مالک رام اس باب میں یوں رقم طراز ہیں:

”غالب نے جو کتابیں بھی عبدالصمد سے پڑھی ہوں، بہت کم امکان ہے کہ وہ ان کتابوں سے مختلف ہوں جو ان کے زمانے میں ہندوستان میں دستیاب ہوتی تھیں اور جو عہد مظلیہ سے یہاں کے مدارس میں رائج اور ذمہ درس و مطالعہ تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ استاد محض کسی کتاب کا متن پڑھا دے پڑا کٹھا نہیں کرتا، وہ فکر و تخیل کو فریاد میں جو کچھ طالب علم کے ذہن نشین کرتا ہے، دیکھا جائے تو تعلیم کا بنیادی اور اہم حصہ وہی ہوتا ہے۔ اس سے شاگرد کی فکر و سمجھ ہوتی ہے اور اسے زبان کے ان رموز و قافیوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، جو کسی

قواعد کی کتاب میں منضبط نہیں ملتے، اس کے دل میں مزید مطالعے کا شوق پیدا ہوتا ہے، جس سے نہ صرف بتدریج اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ نکتہ آفرینی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔“

لہذا غالب نے عبد الصمد سے باقاعدہ معلومات کے بجائے وہ چیز زیادہ حاصل کی ہوگی جسے ہم ”زبان کا ذوق“ کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ کوئی ضروری نہیں کہ غالب نے عبد الصمد سے کچھ کتابیں ہی پڑھی ہوں۔ غالب نے خود کہیں نہیں لکھا ہے کہ میں نے عبد الصمد سے کتابیں پڑھیں۔ وہ تو ”آئین معنی آفرینی و کیش پیکارہ جہی“ اور ”طائف فارسی“ اور ”غوامض فارسی آئینہ بہ عربی“ اور ”حقائق و دقائق زبان فارسی“ کا ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ چیزیں عبد الصمد سے حاصل کیں۔

قاضی عبدالودود نے لفظ ”صمد“ کے معنی کے بارے میں غالب کا قول ”تجہیز“ سے نقل کیا ہے۔ غالب نے اس ضمن میں مولانا فضل حق اور عبد الصمد کا ذکر کچھ اس یقین آفریں انداز میں کیا ہے کہ پورا واقعہ بالکل سچا معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اس کو غالب کا ”فن کارانہ سلیقہ“ کہتے ہیں اور اشاروں اشاروں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب میں قصہ نویسی کا بھی مادہ تھا۔ مالک رام اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ شاید انھوں نے اس بات کو چنداں لائق جواب نہ سمجھا ہو۔ اگر مولانا فضل حق اور غالب کی یہ گفتگو محض من گزشت ہے تو غالب میں انسان کوئی کی صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ لیکن خود قاضی صاحب بعض اوقات دوسروں کے افسانوں یا سرسری بیانات کو غیر ضروری اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حالی اور غالب کے مراسم کے بارے میں قلام رضا خاں نے عبد الغفور شہباز کو لکھا کہ حالی تو غالب کے یہاں گاہ بگاہ ہی آتے تھے۔ ”ان کی نشست وہاں زیادہ نہ تھی۔“ اس غیر ذمہ دارانہ بیان کو قاضی صاحب قبول کرتے ہیں اور مالک رام نے اس پر اچھی گرفت کی ہے۔

مالک رام صاحب نے عبد الصمد کا وجود ثابت کرنے کے لیے مشاق و کلیل کی طرح دلائل اور براہین فراہم کیے ہیں۔ قاضی صاحب کے سر اور جاری از جذبات انداز کے بالتقابل وہ پر جوش نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا عبد الصمد کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں۔ عبد الصمد کا خط بھی، جو غالب کے نام آیا، اس کے وجود کی دلیل بھی شیخہ کے حوالے سے

حالی ہی ہیں۔ دوسری طرف حالی ہی کا بیان ہے کہ کبھی کبھی خود غالب کی زبان سے خاک گیا ہے کہ عبد الصمد محض ایک فرضی شخص ہے، چوں کہ لوگ مجھے بے استدا کہتے تھے، اس لیے میں نے آپ استاد گڑھ لیا۔ مالک دہام نے قاضی صاحب کے اس اعتراض کا جواب نہیں دیا ہے کہ حالی نے ان بیانات کے قصداً کو محسوس کیا اور ان میں قطعی پیدائش کی کو شش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کو شش میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ "لیکن مالک دہام صاحب نے یہ نکتہ بہت خوب نکالا ہے کہ "کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالی لکھتے ہیں کہ "عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔" ظاہر ہے کہ حالی ایمان دار آدمی تھے۔ اگر انھیں کسی قسم کا شک ہو تا کہ عبد الصمد کا وجود محض غالب کی اختراع ہے تو وہ یہ جملہ اسے حتیٰ انداز میں نہ لکھتے۔ وہ غالب کی مدلل مداحی ضرور کر رہے تھے (جیسا کہ قاضی صاحب کا ارشاد ہے)، لیکن عبد الصمد کی شاکر دی غالب کے لیے کوئی مایہ افتخار نہ تھی کہ جس کو ثابت کرنا حالی کے لیے ضروری ہو تا۔ اگر ان سب باتوں کے باوجود حالی صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ عبد الصمد واقعی ایک شخص تھا اور غالب نے اس سے فارسی پڑھی تھی، تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ کم سے کم حالی کی نظر میں عبد الصمد ایک واقعی شخص تھا اور غالب کے "بزرگ تخیل کی ایک صوف" نہیں، بلکہ غالب کی ادبی شخصیت کے سرچشموں میں سے ایک تھا۔

ایک نکتہ، جس پر مالک دہام کی نظر نہیں گئی ہے، خود اس بات سے متعلق ہے کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی خاک گیا کہ عبد الصمد کا کوئی وجود نہیں۔ حالی یہ تو کہتے نہیں کہ میں نے خود غالب کو یہ کہتے سنا کہ عبد الصمد فرضی شخص ہے۔ حالی صرف یہ کہتے ہیں کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی خاک گیا۔ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا۔ حالی یہ بھی نہیں بتاتے کہ یہ بات ان سے کس نے کہی۔ ممکن ہے انھیں غلام رخشاں نے کہی ہو جنھوں نے شہباز کو لکھا کہ عبد الصمد کا وجود بہن میں تھا اس روایت کے مطابق غالب نے عبد الصمد کی شخصیت اس لیے گڑھی کہ لوگ انھیں بے استدا کہتے تھے۔ لیکن اگر یہ سچ ہے تو غالب نے یہ بھی کیوں نہ کہا کہ عبد الصمد نے ان کے فارسی کلام پر اصلاح دی تھی؟ ظاہر ہے کہ "بے استدا" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ غالب کا کوئی معلم نہ تھا۔ (اور اگر یہ

معنی ہیں بھی تو بے استواء ہونے کا اصرار سراسر بے بنیاد اور لامعاکل ظہر تا ہے اور اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں نظر تلی۔) ظاہر ہے کہ ”بے استواء“ کے معنی ہیں ”وہ شخص جس کا کوئی استواء فن شعر میں نہیں۔ وہ شخص جس کے کلام کو کسی استاد کی اصلاح کا استناد حاصل نہیں۔“ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ زبان فارسی کے دقائق و غوامض کو عبدالصمد سے حاصل کرنے کا دعویٰ اس اعتراض کو رفع نہیں کر سکتا کہ غالب ”بے استواء“ ہیں۔ لہذا عبدالصمد کی شخصیت کو ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہذا مجھے اس بات میں بہت شک ہے کہ غالب کی زبان سے واقعی کبھی یا اکثر یہ سنا گیا ہو کہ میاں عبدالصمد محض ایک افسانہ ہے، لوگ مجھے بے استواء کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اسے ایجاد کر لیا۔ جب تک کوئی معتبر شہادت اس بات کی نہ ملے کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا، میں اس روایت کو انتہائی ضعیف قرار دوں گا اور عبدالصمد کے جھگڑے میں اس پر کوئی تکیہ نہ کروں گا۔

ممکن ہے کہ قاضی صاحب مرحوم کو اس بات کا احساس رہا ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عبدالصمد کو ایجاد کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ غالب کو خوف تھا کہ لوگ ”قاطع برہان“ پر اعتراضات کریں گے اور ان کے مبلغ علم پر شک کریں گے۔ لہذا انھوں نے حفاظ بالقدم کے طور پر عبدالصمد کا ذکر ”قاطع برہان“ میں کیا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں:

”غالب دنیا کو یہ دکھاتا چاہتے تھے کہ میں نے ”فارسی کی تحقیق کو اس پائے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔۔۔۔۔ غالب کے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا تھا فارسی دہا کبے جانے کو دل سے نکال دیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، غالب نے ایک ایسا فرضی استاد گڑھ لیا جو علوم عربیہ و فارسیہ پر یکساں تبحر رکھتا تھا اور اس تبحر کو دوسرے فارسی دانان ہند پر اپنے حقوق کی وجہ بتایا۔“

اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ”بے استواء“ ہونے والی بات ٹیڑھ ضروری ہو جاتی ہے اور عبدالصمد کے فرضی ہونے کے بارے میں ایک بے ظاہر مضبوط دلیل بے کار ہوئی جاتی ہے۔ ”قاطع برہان“ کی اشاعت اول (۱۸۶۲ء) کے وقت غالب بیسٹھ سال کے تھے۔ ظاہر

ہے کہ یہ عمر ایسی نہ تھی کہ انھیں ”بے استاد“ کہا جاتا، یا اگر کہا بھی جاتا تو اس سہل بات کی کوئی اہمیت ہوتی۔ لہذا غالب کا یہ سبب قول کہ لوگ مجھے ”بے استاد“ کہتے تھے ۱۸۶۲ء کے بہت پہلے کا ہونا چاہیے، یعنی اس زمانے کا جب خود غالب کی استادی پوری طرح قائم نہ ہوئی تھی۔ لیکن اگر قاضی صاحب کا خیال درست ہے تو غالب نے عبدالصمد کی ”اپنا“ پکی عمر میں، اور اپنی استادی پوری طرح قائم ہو جانے کے بعد کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انھیں ”بے استاد“ کہے جانے کی کوئی فکر نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ ان کے زمانے کی دلی کے دو بڑے قاری داں جنھیں ان کا حریف قرار دیا جاسکتا تھا (یعنی مومن اور صہبائی) دونوں ہی ”قاطع برہان“ کی اشاعت کے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ آزرہ کو غالب کم و بیش اپنا دوست قرار دیتے تھے، حریف نہیں۔ لہذا انھیں آزرہ کی طرف سے اس طعن کا خوف نہ تھا۔ ایسی صورت میں ۶۵ سالہ غالب کو کیا ضرورت تھی کہ وہ عبدالصمد کی ایجاد کرتے؟ اور اگر وہ اوائل عمری اور اوائل استادی میں ”بے استاد“ کہے جانے کے جواب میں ”عبدالصمد“ کو اپنا استاد بتا چکے تھے تو پھر قاضی صاحب کا یہ خیال بے اصل ہو جاتا ہے کہ غالب نے ”قاطع برہان“ کی اشاعت کے وقت حفظ مائتھم کے طور پر عبدالصمد نام کا ”فرضی استاد“ گڑھ ”کیا۔ دوسری طرف یہ بھی طوطا رکھیے کہ اگر اوائل عمری اور اوائل استادی میں غالب کو ”بے استاد“ کہا گیا تو عبدالصمد کی ایجاد اس طعن کو رفع نہیں کر سکتی، کیوں کہ عبدالصمد جو بھی رہا ہو، اس کے بارے میں غالب نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے میرے کلام پر اصلاح دی۔ ایک بات یہ بھی دھیان میں رکھیے کہ اگر اپنے لیے کسی استاد کی ایجاد غالب نے کبھی ضروری سمجھی ہوگی تو وہ کلکتے والے معاملے کا وقت رہا ہوگا۔ لیکن اس وقت نہ تو کسی نے غالب کو ”بے استاد“ کہا اور نہ غالب نے عبدالصمد کا ہی ذکر کیا۔ کلکتے میں غالب اسی سال کے نووارد تھے، وہاں زیادہ امکان تھا کہ لوگ ان پر تعریض کرتے کہ جناب آپ کس استاد کے شاگرد ہیں جو قلیل وغیرہ کو امتداد سے جاری قرار دیتے ہیں؟ لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

غالب کے جن بیانات کی بنا پر قاضی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب نے عبدالصمد سے اصلاح شعر بھی حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے بارے میں مالک رام صاحب کا

تھا کہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان بیانات سے اصلاح شعر کے معنی مستحکم نہیں ہوتے۔ یوں بھی عبدالصمد جو بھی رہا ہو، شاعر نہ تھا۔ لہذا اس سے اصلاح شعر حاصل کرنے میں کسی قسم کا اعزاز نہیں، بلکہ ایک طرح کی توہین ہی ہے کہ استاد بنایا بھی تو ایک غیر شاعر کو۔

لہذا عبدالصمد کے وجود پر بالکل راسخ صاحب کے دلائل غالب کے مزاج و افتاد طبع سے امن کی وجدانی مناسبت کے آئینہ دار ہیں اور مدلل فکر کا بھی حکم رکھتے ہیں۔ ان کے دلائل پر اضافہ کیا جاسکتا ہے، ان کے بعض استدلال بہت مستحکم نہیں ہیں، لیکن مجموعی طور پر امن کا فیصلہ اس وقت تک کی معلومات اور فکر کی روشنی میں صحیح ہے۔ عبدالصمد یقیناً ایک شخص تھا۔ اب یہ معاملہ عبدالصمد اور غالب کے درمیان ہے کہ شاگرد نے استاد سے کیا سیکھا اور کیا پایا۔

سکھن غن از پایے غالب نہ ز ہوش است
 امروز کہ مستم خبرے خواہم لادو داد

میرزا غالب، دیوان غزلیات فارسی

غالب افسانہ

میں نسلا راجپوت اور مولد انظام آباد، ضلع اعظم گڑھ کا ہوں۔ اعلیٰ حضرت مہابلی غلدہ آشیانی کے وقتوں میں بلایا اور اس کے اطراف کے بھوی ہاروں نے کچھ شورش کی تو ان کی سرکوبی کے لیے افواج شاہی علاقہ پٹیالہ، بچہ پورہ اور پنجتھو سے بھیجی گئیں۔ ان میں بہت سے راجپوت، پٹھان اور سید بھی تھے۔ شورش تو بہت جلد فرد ہو گئی، لیکن فوج کے سواروں، نفروں اور بعض رسالداروں کو بھی پورب کے یہ علاقے اتنے پسند آئے کہ، کچھ ہم یہیں بس رہے۔ سر اے رائی، سبھر پورہ، خراسان (جیسے اب خراسوں کہتے ہیں)، سر اے میر یہ مواضع اسی زمانے میں آباد ہوئے۔ نظام آباد الہت قدیم الایام سے موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جیوش اکبری کے ساتھ آنے والوں میں کچھ میرے بھی اجداد تھے جنہوں نے نظام آباد میں سکونت اختیار کی۔ لیکن ہمارے گھرانے کو اصل فرد ختب ملا جب شہنشاہ ہند وستان و دکن، اعلیٰ حضرت محی السنّت والدین فردوس مکانی اورنگ زیب عالمگیر کے مبارک دور دورہ سلطانی میں اعظم خان اور عظمت خان دو بھائیوں کو دکنک شاہی کے ذریعے ان اطراف کی جاکیر و طغی تقویٰ بخش ہوئی۔ اعظم خان نے اعظم گڑھ آباد کیا اور عظمت خان نے اعظم گڑھ سے کوئی دس کوس شمال مغرب میں عظمت گڑھ۔ اعظم خان کے سوار و منصب داروں میں سے کچھ بے شک میرے اجداد تھے جو علاقہ پنجاب سے اٹھے تھے اور یہاں نظام آباد میں آجے۔

ہم لوگ ہے ہے جس کے چند رشتی راجپوت ہیں۔ جنگ و جدل کے علاوہ علم و ہنر بھی ہمارے گھرانے کی پہچان رہا ہے۔ فردوس آرام گاہ اعلیٰ حضرت روشن اختر محمد شاہ ہاشم غازی کے عہد سعادت بنیاد میں زمین و مالک کے جھگڑے اٹھے تو ہمارے ایک بزرگ نے ناراض

ہو کر علاحدہ کی اختیار کرنی۔ اور یہ علاحدہ کی اتنی شدید ہوئی کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے اخلاف بھی مسلمان رہے، اور کچھ اللہ اب بھی نکلیں جو اچھا ہیں، مذہب اسلام کے پیرو ہوں گے۔ میرے جد اعلیٰ اپنے قدیمی مسلک پر رہے، اور میں بھی البتہ کی کہ اسے اسی پر قائم ہوں۔ اپنے مسلمان بھائیوں سے ہمارا ربط آہستہ آہستہ پھر استوار ہوا تو ملنا جلتا، ریت ر سم، یہاں تک کہ ایک آدھ ہار تو شادی بیاہ کے بھی مراسم بن گئے۔ ایسے موقعوں پر گوار تک چٹنے کی نوبت آگئی، لیکن مرد و لیا م کے ساتھ سب برابر ہو گیا۔

ہمارے دواولنے اسلحہ سازی کا کام شوقیہ اختیار کیا۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو اپنے اسلحہ کے بارے میں ویسا ہی علم و احتیاد رکھنا چاہیے جیسا اپنی اولاد یا بیوی کے بارے میں ہوتا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اپنا اسلحہ خود بنانے سے بہتر کوئی طریقہ اپنے ہتھیار کو جاننے اور سمجھنے کا نہیں ہے۔ فلول اول تو وہ قدیم انداز کے تیغ، قدحہر اور شیر پنجے ہی بناتے تھے، لیکن ایک بیسائی پادری کے طعنہ دینے پر کہ تم ہندوستانی لوگوں کو ہمارے ہتھیار بنانا مشکل ہے، انھوں نے طرح طرح کی قرأتیں، سوچاڑے اور گھومو بھی بنانے شروع کر دیے اور اس فن میں وہ اس قدر کامیاب ہوئے کہ کچھنی بہادر کے سپاہی اور اطراف کے ذکیت دوخوں ہی بڑی قیمت دے کر ان سے ہتھیار مول لے جاتے تھے۔ میرے باپ کا زمانہ آتے آتے ہمارا پیشہ اسلحہ سازی کے بجائے اسلحہ سازی ہو گیا۔

ہمارے قصبہ نظام آباد کے بعض جاں نلیوں میں ایک خاص قسم کی سیاد مٹی نکلتی ہے۔ اس کے برتن بہت اچھے بنتے ہیں، اور دور دور و سار کو جاتے ہیں۔ ایک کھار کا بیٹا میرا دوست بن گیا تو میں نے ہابو جی قبلہ سے چوری چھپے اس کا فن بھی سیکھ لیا۔ کیا معلوم تھا کہ ایک دن اس ہنر سے مجھے کچھ تمتع بھی ہو سکے گا۔

ہمارے گھرانے کی دونوں شائیں اعظم خان اور عظمت خان کی اولادوں، اور اس طرح آل تہور کے فرماں رواؤں کی خدمت کو اپنا دین و ایمان جانتی تھیں۔ بکسر کی جنگ (۱۶۵۷ء، مرتب) میں بکسر یے تو دونوں طرف سے لڑے تھے، کہ کچھ کرائے کے ٹٹوں کے طور پر کچھنی بہادر کے جھنڈے تلے تھے، اور کچھ ایسے تھے جو حضور فیض گجور اعلیٰ حضرت

شاہ عالم ثانی شہنشاہ ہند اور نواب وزیر کی فوجوں میں تھے۔ لیکن ہمارے گھرانے کے جتنے لوگ اس جنگ میں شریک تھے، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے سب اعلیٰ حضرت کے لواے سلطنت و سلطنت کے ہی سائے میں تھے۔ اس جنگ میں ہمارے دونوں گھرانوں کے اکیس سواروں نے جام شہادت نوش کیا۔

بکسر کے بعد بھی ہماری و قادری اعلیٰ حضرت اور نواب وزیر سے رشتہ۔ لیکن خود حالی جناب جنت مآب شاہ عالم ثانی نے بہار اور بنگال کی دیوانی کچنی بہار کو سوئپ دی اور نواب وزیر اس کے چند برس بعد اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنت مآب اپنی تمام خوبیوں اور حکمت عملیوں کے باوجود انگریز کے جال سے نہ نکل سکے۔ مرٹھا سردار مہاراجی نے انھیں اللہ آباد سے نجات دلائی اور لن کا وکیل مطلق بن کر راج کر بارہا ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی موت کے بعد جنت مآب ملکی سیاست کے نقشے پر بے اثر ہو گئے۔ مرٹھا کے مرنے کے بعد انگریز کو پھر موقع ملا تو اس نے اعلیٰ حضرت کو اپنی "حفاظت" میں لے لیا۔

لکھ لٹ نواب وزیر آصف الدولہ میر درد عدنان مقام کے زمانہ مسعود و محفوظ تک تو ہم اودھ کے زیر پرورش اور زیر نگین رہے۔ لیکن وزیر علی خان مغفور کو بنا کر مرزا منگی مرحوم جنت آرام گاہ کو مسند وزارت دلانے میں خان علامہ اور دوسروں نے جو دکھ اٹھائے اور انھوں نے، ان میں اودھ کے آدھے علاقے کا تحویل وزارت سے نکل کر انگریزوں کے چنگل میں جانا بھی تھا۔ اس طرح ہم لوگ لفظ و معنایہ قید فرنگ میں آ گئے۔ دلوں میں ویسی ویسی آگ سلگتی رہی، لیکن ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

خان علامہ اور میر سے دادا میں پرانی ملاقات تھی، اور وجہ ملاقات وہی اسلحہ سلائی۔ علامہ موصوف کو میر سے دلائی ہوئی گھڑیاں بہت پسند تھیں۔ وہ انھیں منگو کر اپنے انگریز دوستوں کو نذر کرتے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے اواخر میں بڑے لاث کے دربار میں نواب وزیر کی طرف سے عہدہ کالٹ سنبھالنے کی غرض سے کلکتہ جاتے ہوئے خان علامہ اپنے بعض عزیز اور میر سے دادا جہان سے ملنے اعظم گڑھ بھی آئے تھے۔ دادا نے انھیں حسب سابق اپنی بٹائی ہوئی ایک گھڑی اور ایک قرابین پیش کیں۔ لیکن اس بار انھوں نے تھوڑی رہنمائی کا بھی

اٹھہار کیا کہ خان علامہ نے سعادت علی خان کو نواب و وزیر بنوانے میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ الہ آباد سے لے کر بریلی تک کتنا بڑا علاقہ انگریز کے ہاتھ میں دلوادیا گیا۔ خان علامہ نے فرمایا ”بھولنی سنگھ وہ چند ضلع دے کر میں نے اودھ کو بچالیا۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ اودھ کیا سارا ملک ہند ہی ملک کو دہلی مان لے گا۔“

میری پیدائش ۱۸۳۷ء کی ہے۔ میں اپنے والدین کی انکوتی اولاد تھا۔ دستور کے مطابق مجھے آلات حرب و ضرب کے علاوہ قلم کا بھی ہنر سکھایا گیا۔ میں نے گھر پر فارسی، عربی اور تھوڑی بہت ریاضی سیکھی۔ پھر مولانا قاروق چریا کوئی کے ایک شاگرد کے مدرسے میں ہاتھ اندھ تعلیم کے لیے بٹھادیا گیا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ۱۸۳۴ء میں اعظم گڑھ میں کچھ پادریوں نے ایک انگریزی اسکول کھولا تھا، دینی اسکول کے نام سے۔ (دینی اسکول ایک مدت سے دینی اعتر کالج ہو گیا ہے اور اپنی پرانی جگہ پر اب تک موجود ہے، مرتب۔) میرے والد کے ایک دوست جو کینٹی بھادوی نوکری کر چکے تھے، مصر ہوئے کہ بنی بادھو کو انگریزی پڑھاؤ، کہ اسی میں اب کار پار نکلی دہلی و فوجی چلے گا۔ ان کی روز روز کی ضد سے شک آخر میرے قبلہ نے میرا نام وہاں لکھا ہی دیا۔ اس وقت میری عمر کوئی دس برس کی تھی۔

انگریزی مدرسے میں فارسی انگریزی، ریاضی اور تاریخ وغیرہ کے ساتھ ساتھ کر خان مذہب کی باتیں اور ایک نئی چیز اور پڑھوائی جاتی تھی، جسے وہ لوگ ”ہندی“ کہتے تھے۔ یہ تھی تو وہی ہندی، جسے ہم گھروں میں بولتے تھے، لیکن اسے شکر حروف میں لکھا جاتا تھا اور اس میں ہماری ہندی کے ٹھٹھے، رواں لفظوں کی جگہ خدا جانے کہاں کہاں کے لفظ بھر دیے گئے تھے۔ مجھے وہ زبان بڑی عجیب سی لگی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہو کر پختہ لکھوں گا۔ ہندی کا شاعر ہوں گا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نئی ”ہندی“ میں حضرت میر تقی میر علی اللہ مقام اور قبلہ میر ہر علی صاحب انیس کی طرح کا کلام کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ میں نے بعض ماسٹر صاحبان کو یہ بھی کہتے سنا کہ ”ہندی“ ایک الگ زبان ہے۔ یہ ہندوؤں کی زبان ہے، مسلمانوں کی زبان نہ پختہ یا اردو کہلاتی ہے۔

اس اسکول میں کچھ ایسے بھی بچے تھے جن کی وہاں کے اساتذہ میں بڑی آؤ بھگت تھی۔

چہرے بھرے اور چال وصال سے تو وہ ہمارے ہی جیسے تھے، اگرچہ ذرا انہی ذات کے، لیکن ان کے نام عجیب تھے، آدمی ہندوستانی اور آدمی کرہائی۔ مشکلہ ایک لڑکے کا نام تھا سہوکل سنگھ۔ ایک اور لڑکا تھا، اس کا نام تھا لارن داس (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لارنس داس تھا)۔ ایک اور لڑکا جو ہم میں سب سے بڑا تھا، جان مسیح الدین کہلاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا اچھا تھا اور موقع بے موقع ہم لوگوں کو پیٹنے سے گریز نہ کرتا تھا۔ یہ سب لڑکے کوئی چیز بچسہ ہوتی تھی وہ کرا کے کرہائی ہو چکے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ بچسہ بھی غصے کی قسم کی کوئی رسم ہوتی ہوگی۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ اس میں کسی متبرک پانی کے پیسنے دیے جاتے ہیں۔

خیر، ان لڑکوں میں ہم لوگوں کے خلاف ایسا بہت تھا۔ اور وہ کوشش کر کے ہم لوگوں سے مختلف لہجے میں اور خلاف عادی ہندی بولنے کا خاص التزام رکھتے تھے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہ بھائے۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے بچسہ نہ لیا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ہم لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ اسکول میں ایک دو انگریز بھی تھے۔ اور میرے لیے انگریزوں کو قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی بولی میری سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن خدا معلوم کیوں مجھے ان سے ڈر لگتا تھا ہم لوگوں سے وہ بہت شصے لہجے میں بولتے، لیکن موقع پڑنے پر سخت سزا دینے سے نہ چوکتے تھے۔ وقت کی پابندی وہاں بہت تھی۔ میں ہمیشہ دیر تک سونے والا، اکثر تعویق سے اسکول پہنچتا اور سزا کا مستوجب ٹھہرتا۔ ایک بار میں کچھ جلدی چمٹی ہو جانے کی خوشی سے مغلوب ہو کر اسکول کے بڑے ہل کمرے سے ذرا شور و غل کرتا ہوا گزر رہا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ بڑے ماسٹر صاحب سن رہے ہیں۔ فوراً کچڑا بلایا گیا اور دس بیت کا سختی قرار دیا گیا۔ یہ سزا ایک جلا صفت ماسٹر امینوکل لال کے ہاتھوں دلوائی گئی۔

میں دینی اسکول میں بہت دن رہا نہیں۔ دوسرے میرے فرشتہ سیرت والد کو برادری والے ملنے دیتے کہ تم بچے کو بھرشت کیے دے رہے ہو۔ اور دوسرے مجھے اسکول کی ”ہندی“ اور جان مسیح الدین ایسے ڈور صفت لڑکوں کا دست تھاؤں بد شوق بنائے دیتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی میں نے ضرور سیکھ لی اور چھٹی جماعت میں جوں توں کر کے کامیاب

ہونے کے بعد میں نے اسکول چھوڑ دیا۔ اب وہی مدرسہ تھا اور وہی قاری، تھوڑی سی عربی اور ریاضی و منطق دیتے۔ گھر پر بیوٹ، گنگا، تنج ذنی، ہندوئی بازی کی مشق ہوتی تھی۔ محلے کے اکھاڑے میں کشتی ہو جاتی تھی۔ میں نظام آباد سے اعظم گڑھ چار کوس پیدل آتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بھی بدن خوب کسرتی ہو گیا تھا۔

لیکن مجھے تو شاعر بننے کی دھن تھی۔ ایک دن والد محترم نے مجھے کچھ شعر سناتے دیکھ لیا۔ بڑی ڈانٹ پڑی اور دادا جان سے شکایت بھی ہوئی۔ پر بیٹھو! انھیں پتر جنم سے بچائے، مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بولے، "تو کیا ہوا؟ شرفا کے کاسوں میں سے ایک کام یہ بھی ہے۔ اسے کچھ نہ کہو۔ ہماری ایک ہی تو اولاد ہے۔"

دو تین سال آرام سے گزرے۔ کچھ پڑھنے پڑھانے اور شعر کہنے میں اور کچھ مشق تھرو تنگ اور تنج و جدھر میں۔ دادا جان بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور والد کے یہاں بھی کسی دوسری بلاؤ کی توقع نہ تھی۔ عام راجپوتوں کے علی الرغم ہمارے گھرانے میں تعدد اولاد و ملج کا طریقہ بالکل نہ تھا۔ ہاں چوری جیسے یا علی الاطلاق، حلق کرنے کی بات اور تھی۔ لہذا میں تنہا ہی اولاد رہ کر جیا۔ ایک دن دادا جان کو معلوم ہوا کہ خاں علامہ کے دادا استاد ملا صاحب بنارس کے ایک پوتے مولوی خدام حسین ناظم ہمارے قصبے کے پاس ہی تحصیل کے صدر مقام عمر آباد میں منصف ہو کر آئے ہیں۔ دادا نے فرمایا کہ استاد کے بغیر شاعر نہیں بننا چاہا۔ چلو قصص مولوی صاحب کا شاگرد بنو لوں۔

ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر قزل وقت پہنچے، خاں علامہ کا نام درمیان میں لا کر اطلاع کرائی۔ مولوی صاحب خود باہر آکر ہم لوگوں کو اپنے دیوان خانے میں لائے۔ صبر پان سے تواضع کی۔ مولوی صاحب مغل وضع کی چو کو شیر ٹوپی اور جدید طرز کا لمبا جند پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی، گلے میں مثل کا لمبا کرتا، ہاتھ میں حقیقی احمر کی تنج۔ میں دل میں بہت ڈرا ہوا تھا، لیکن ان کو دیکھ کر ایک طرف فرحت کا احساس ہوا۔ گلابی جاڑے تھے، دیوان خانہ میں بجلی بجی خوشبو شامہ العمر کی پھیلی ہوئی تھی۔ دادا مرحوم نے عرض مدعا کی تو مولوی صاحب نے فرمایا، "میں تھکس کیا کرتے ہو؟" میں نے دہلی زبان سے عرض

کیا۔ ”جی شخص کا گتہ کار ابھی نہیں ہوا۔“ مولوی صاحب ذرا مسکرائے، ایک لمبی سی ہوں کی۔ پھر ایک لٹکے چپ رہ کر بولے۔ ”اچھا تو میاں جینی ماحو، تم ہے ہے شخص کے راجپوت، صاحب تنخواہ سپر خاندان کے چشم و چراغ، شاعری کر کے اپنے گمراہے کو رسوا کرنے پر اتار دو، تو لو ہم تمہارا تخلص ”رُسا“ تجویز کرتے ہیں۔“

دادا صاحب اور میں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ”بہت خوب۔“ مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پور کہا ”اچھا اب اپنا کوئی شعر تو پڑھو۔“ میرا تو دم ہی نکل گیا۔ تنکھیوں سے دادا جان کی طرف دیکھا، لیکن وہ تو بالکل بے تعلق سے ہو گئے تھے۔ جبراً قہراً یہ مطلع میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پڑھا:

ہستی کو حجاب کھجے گا
ہر سانس کو آب کھجے گا

مولوی صاحب نے فرمایا ”خوب۔ لیکن ’کھجے‘ بد وزن کا نون اب اچھا نہیں لگتا۔ اسے ’چلے‘ کر دو۔“ ابھی میں کچھ کہنے والا تھا کہ آپ نے مزید ارشاد فرمایا ”اور میاں صاحب، سانس کو آب کہنے کی نہ کوئی دلیل ہے، اور نہ بین المعصر مستثنیٰ رہا ہی قائم ہوتا ہے۔ اسے یوں کر دیں، ’عالم کو آب چلے گا اور اسے مصرع کوئی قرار دیں تو کیسی رہے؟ کچھ کچھ عروض بھی جانتے ہو؟“

میں نے ایک ایک کر عرض کی ”جی حضور اور اصلاحی مصرع کافی میں تنکین اوسط ہے۔“

مولوی صاحب نے پھر فرمایا ”خوب۔“ دادا صاحب گویا اب متوجہ ہوئے۔ ارشاد ہوا ”سبحان اللہ حضرت، کیا اصلاحیں صادر فرمائی ہیں۔“ مولوی صاحب کے اصرار پر میں نے ایک شعر اور پڑھا:

افسوس ساتھ میرے یادوں نے دشمنی کی

اس کی گلی میں رہتا تو چاکری ہی کرتا

مولوی صاحب نے ایک لٹکے سکوت فرمایا، پھر کہا، ”ہاں شیخ، رخ کے رنگ کا شعر ہے۔“

شاعر مرحوم اکثر اشعاروں میں بات کہتے تھے۔ خود فرمایا ہے:

ہے بیت ہی میں معنی بیت خیال بند
نزدیک ہے بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے
لیکن قصارے شعر کی بندش صاف نہیں بیٹھی۔ پہلا مصرع یوں کر دو۔
دنیا کی بادشاہی کس کام کی ہے میرے

اب بات ذرا سامنے کی ہو گئی، لیکن صاف ہے۔ دیکھو مہندی کو صفائی اور زیادہ ضروری ہے۔
”بات میری سمجھ میں ٹھیک سے نہ آئی تھی، لیکن دادا صاحب مرحوم ”بہت خوب، بہت مناسب“ کہتے رہے۔ مولوی صاحب نے یہ کہہ کر ہم کو رخصت کیا کہ ”بھئی ہمیں اتنی فرصت نہیں کہ تم جیسے نوجوان کی آمد شعر پر اصلاح دیتے رہیں۔ کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہوں تو ایک آدھ غزل دکھایا کرتا۔“

جب ہم باہر نکلے تو ہمیں دیکھ کر حیرت اور شرمندگی ہوئی کہ دو سیر شیرینی جو ہم بطور نذر لائے تھے، اس کے عوض مولوی صاحب قبلہ نے کوئی مہینہ بھر کا سیدھا اور کئی طرح کے پھل اور ترکاریاں ہمارے لیے پتل گاڑی پر لدا کر چل کر ادی تھیں۔ مولوی صاحب اندر جا چکے تھے، شکر یہ کہ ابھی موقع نہ تھا، ہم ان کی کرم فرمائیاں اور شاعرانہ قوتوں پر عش عش کرتے گھر لوٹے۔

میں مولوی خلوم حسین ناظم کا شاگرد کیا جانا کہ اپنے حسابوں قادرغ تحصیل ہو گیا۔ مدد سے جانا چھوڑ کر سارا وقت شعر و شاعری اور حیر و تفنگ میں گزارنے لگا۔ پھر ایک جگہ کچھ معاملات دل بھی ٹکلی آئے۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ تھا۔ بات بہت آگے نہ بڑھی لیکن دل لگانے اور دلگی کا تو سامان تھا ہی۔ میں سولہ برس کا خاصا وجہہ جو ان نکلا تھا۔ کسرتی بدن، گھر میں کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ والدین کا لاڈ بیکار لگے اور کیا چاہیے تھا؟

لیکن ۱۸۵۶ء کا سال مجھ پر کچھ عجیب بھاری گزرا۔ آدھ کی سلطنت کے استراخ کا ہم لوگوں پر برادر است اثر یہ پڑا کہ نکلتے کے بڑے لاٹ کے خلاف دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑنے لگی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اشیا کی قیمتیں آپ سے آپ بڑھنے لگی تھیں۔

ضروری اشیا بھی عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اودھ کی پیدوار اب مشرقی اضلاع میں آتا بند ہو گئی ہے۔ مونے اور باریک اناج سب ایک بھاؤ ہو کر روپے کے آٹھ نویر بکنے لگے۔ لوگوں میں خبر آزی کہ کسمپنی نے اودھ اور اطراف کا سارا مال ولایت بھیج دیا۔

بادشاہ جان عالم کے نکلنے پہنچنے کے چند ہفتے بعد لوگوں میں خفیہ باتیں مشہور ہونے لگیں کہ نہ صرف اودھ، بلکہ دلی کی بھی بادشاہت واپس آنے والی ہے۔ کبھی کبھی کوئی شخص سرگوشی میں ”چچاٹی“ نام کی کسی چیز کا ذکر کرتا جو دراصل خفیہ پیغام رسانی کا ایک طریقہ تھی۔ کبھی کوئی کہتا کہ منڈیاؤں کی چھاؤنی میں جو فوج کسمپنی بہادر نے شاہ اودھ کو دبائے رکھنے کے لیے متعین کر رکھی تھی، اب وہ باقی ہونے والی ہے، یا ہو گئی ہے۔ آرکات کے ڈاکشاہ کا ذکر ۱۸۵۷ء کے اواخر میں رہائوں پر پھیلنے لگا کہ وہ جہاں جاتے ہیں، ان کے آگے آگے ڈاکشاہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے سردار آرہے ہیں۔ اپنے سوا غلط میں وہ (ان کا اصل نام بعد میں معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ ہے) کھلے ہندو ہندو مسلمان دونوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد جنگ کی ترغیب دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کی حکومت بے دینی اور باطل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ ہندو مسلمان دونوں سے ان کا مذہب چھڑا کر انھیں خدا سے دور کر دیں گے۔

یہ سٹشی کی باتیں میرے نوجوان خون میں مگری اور بھجوت کی لہریں دوڑا رہی تھیں اور میں بھی یکے اٹنے سیدھے خواب دیکھنے لگا تھا کہ میرے دلوا جان کا انتقال ۱۸۵۷ء کے بالکل آخر میں اچانک تھوڑی سی طحالت کے بعد ہو گیا۔ وہ چھپای برس کے تھے، لیکن ان کی صحت ہم نوجوانوں کی سی تھی۔ کسی کو اندیشہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلد راسی ملک عدم ہوں گے۔ بعد کے زمانے میں مجھے اکثر خیال آتا کہ شاید ان کی پاک روح نے محسوس کر لیا تھا کہ اناے وطن پر جو ستم انگریز بہادر کی طرف سے ٹوٹیں گے، ان کو دیکھنے سے پہلے ہی آنکھ بند کر لینا بہتر ہے۔

۱۸۵۷ء کو شروع ہوئے ایک دو مہینے گزرے تھے کہ چپکے چپکے یہ خبر پھیلی کہ ڈاکشاہ کو انگریزوں نے فیض آباد میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہمارے لوگوں میں عجب بے چینی اور شکش سی پھیل گئی۔ میں نے ایک دن اپنے والد کو میری ماں سے کہتے سنا کہ بنی مادھو کو اس کے ماسوں

کے پاس شاہجہاں پور پہنچ دو۔ یہاں حالات اب دیگر گروں ہونے والے ہیں۔

پھر ایک رات یہ خبر جنگل کی آگ کی سی تیزی سے پھیلی کہ میرٹھ میں انگریزوں کے ساتھ کچھ بہت خراب سلوک دیسی سپاہیوں کے ہاتھوں ہوا اور فرنگی سب میرٹھ، بلند شہر وغیرہ چھوڑ چھوڑ کر پنجاب کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ واقعہ کیا ہوا، اس کی تفصیل نہ معلوم ہوئی، مگر اس کے کہ سپاہیوں کو ایسے کار توں منہ سے کانٹے کوٹے تھے جن میں سو ریا کنوی چربی تھی۔ منگل پانچ رے نای سپاہی نے کار توں کو کانٹے سے انکار کیا اور اپنے انگریز افسر کو گولی مار دی۔ کہا جا رہا تھا کہ انگریزوں نے یہ خبر دیا رکھی تھی لیکن اب یہ ہر طرف پھیل گئی ہے۔ دیسی سپاہی جبکہ جبکہ خروج کر رہے ہیں اور اعلیٰ حضرت علی سبحانی ابو ظفر سراج الدین بہادر شہہ مانی کو شہہ ہند کا لقب دے کر دوبارہ تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن اور نزدیک کی یہ خبر آئی کہ دیسی سپاہیوں اور ڈاکشاہ کے ساتھیوں نے فیض آباد کا جیل خانہ توڑ کر ڈاکشاہ کو رہا کر لیا ہے اور اب وہ ایک جم خفیہ کے ساتھ عازم لکھنؤ ہیں۔

اسی رات بہت دیر گئے ایک عوامند بوڑھا منٹو پر ڈاکشاہ باندھے ہاری گڑھی پر آیا کہ میں بلایا کے بابو کنور سنگھ کا اہلی ہوں، مجھے تھا کہ صاحب سے ملنا ہے۔ بابو کنور سنگھ کی عمر اس وقت اتنی کے قریب تھی، ان کا راج چھوٹا سا لیکن وید بہ دور دور تک تھا۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور اپنے علاقے میں آنے والے گوروں کو سر ہاندا لگا لیاں دلواتے تھے۔ میرے والد نے اہلی سے کچھ بات کیے بغیر اس کا مدعا سمجھ لیا۔ مجھے انھوں نے اسی اہلی کے ایک نائب کی معیت میں رات ہی رات شاہجہاں پور روانہ کر دیا۔ میں نے ہزار کہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا، لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ دوا امر حوم کے برخلاف وہ مزاج کے تیز بہت تھے، اور ان کے سامنے کسی کو تاپ مقناومت نہ تھی۔ میں تو ان کا بچہ ہی تھا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ صبح ہوتے ہوتے میرے والد بھی چند جاں نثاروں کو ساتھ لے کر کنور سنگھ کی طرف نکل گئے۔ ہاری گڑھی پر میری والدہ اور کچھ بوڑھے نوکر رہ گئے۔

لاٹائی کا وہ سارا زمانہ میں نے شاہجہاں پور کے ایک قصبے روضہ کے باہر اپنے ماموں کے گھری چنگے میں گزرا۔ ماموں کے آدمی ہر وقت مجھ پر کڑی نگاہ رکھتے کہ کہیں گھر سے نکل نہ

جاؤں۔ لڑائی کی خبریں کبھی کبھی وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہندوستانی سپاہ کی ہر فتح کے ساتھ میرا دل بیسوں اچھلتا اور ہر شکست کے ساتھ اتنا ہی ڈوب جاتا۔ ۱۸۵۸ء کا وسط آتے آتے جنگ ختم ہونے لگی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بھی چھٹکے لگا تھا۔ میں نے دل میں ضمان لی کہ مناسب موقع دیکھ کر جنگے کی اونچی دیوار پھانسی کر نکل جاؤں گا اور یہ جس قدر کی سپاہ سے جا ملوں گا۔

میں اپنے لیے سواری کا انتظام کر رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریکیں تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اندھیری کی فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں میں وہاں سے نکل لوں۔ اچانک مجھے ایک ملازم نے چپکے سے بتایا کہ برہمن قدر، جنگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، یہ سب الگ الگ جنگوں میں ہزیمت اٹھا کر شمال کی طرف جانے والے ہیں۔ انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں اور نہ اس کی کوئی توقع ان سے یا ان کے ساتھیوں سے ہے۔ اسی شام یہ اطلاع میرے جسم کو جھنجھوڑ گئی کہ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے ڈور کے عزیز بھگتا تھ سکے راجہ پولیاں کے یہاں قیام پذیر ہونے والے ہیں۔ پولیاں ہمارے قصبے روضہ سے بہت قریب نہ تھا، لیکن ایک رات کے دھاوے میں وہاں پہنچنا ممکن تھا۔

گئی رات میں کندہ لٹکا کر اور ہاتھ پاؤں تھکانے کا خطرہ مول لے کر جنگے کی اونچی دیوار سے اتر کر ایک وقار ملازم دو عمدہ گھوڑوں کے ساتھ خنجر تھا بے نشان بھاگتے ہوئے ہم دن نکلے پولیاں کی سرحد کے پاس پہنچے تو ہر طرف فرنگی جھنڈوں اور فوجوں کا جھوم دیکھا۔ میرا ہاتھ خشکا۔ وہیں تک کہ میں نے سرگوشیوں میں یہ سنوس خبر سنی کہ راجہ پولیاں کی غداری نے ڈنکا شاہ کی جان لے لی۔ تھوڑی سی دیر میں یہ بات بالکل مکمل گئی جب میں نے گھاؤں کی عورتوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ڈنکا شاہ کے ماتم میں سینہ زنی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ان کے پیچھے ہی چند عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر بھگتا تھ سکے کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ کینی کے سپاہی انھیں دھکیل دھکیل کر گھاؤں کے اندر لے جا رہے تھے۔

دنیا میری نظر میں تاریک ہو گئی۔ یہ بات اب بالکل صاف تھی کہ ہندی افواج کو ہر جگہ شکست ہو چکی۔ اب کچھ رہانہ تھا جس کے لیے جنگ کی جائے۔ ملازم کو تو میں نے وہیں

جاؤں۔ لڑائی کی خبریں کبھی کبھی وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہندوستانی سپاہ کی ہر فتح کے ساتھ میرادل بیسوں اچھلتا اور ہر شکست کے ساتھ اتکا ہی ڈوب جاتا۔ ۱۸۵۸ء کا وسط آتے آتے جنگ ختم ہونے لگی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بھی پھٹکنے لگا تھا۔ میں نے دل میں ضمان لی کہ مناسب موقع دیکھ کر جنگ کی اونچی دیوار چھانہ کر نکل جاؤں گا اور برہمیں قدر کی سپاہ سے جا ملوں گا۔

میں اپنے لیے سواری کا انتظام کر رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اندھیری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں میں وہاں سے نکل لوں۔ اچانک مجھے ایک ملازم نے چپکے سے بتایا کہ برہمیں قدر، جنگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، یہ سب الگ الگ جنگوں میں ہزیمت اٹھا کر شمال کی طرف جانے والے ہیں۔ انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں اور نہ اس کی کوئی توقع ان سے یا ان کے ساتھیوں سے ہے۔ اسی شام یہ اطلاع میرے جسم کو جھنجھوڑ گئی کہ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے دور کے عزیز جنگتا تھا۔ سکھ راجہ پولیاں کے یہاں قیام پزیر ہونے والے ہیں۔ پولیاں ہمارے قصبے روضہ سے بہت قریب نہ تھا، لیکن ایک رات کے دھماکے میں وہاں پہنچنا ممکن تھا۔

گلی رات میں گند لٹکا کر اور ہاتھ پاؤں تھانے کا خطرہ مول لے کر جنگی کی اونچی دیوار سے اترا۔ ایک وقار ملازم دو عمدہ گھوڑوں کے ساتھ فتنہ تھا۔ بے تکان بھاگتے ہوئے ہم دن نکلے پولیاں کی سرحد کے پاس پہنچے تو ہر طرف فرنگی جہتوں اور فوجوں کا ہجوم دیکھا۔ میرا تھا شکار۔ وہیں رک کر میں نے سرگوشیوں میں یہ سنوس خبر سنی کہ راجہ پولیاں کی غداری نے ڈنکا شاہ کی جان لے لی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات بالکل کھل گئی جب میں نے گاؤں کی عورتوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ڈنکا شاہ کے ماتم میں سینہ زنی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ان کے پیچھے ہی چند عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر جنگتا تھا۔ سکھ کو نہ اہملا کہہ رہی تھیں۔ کبھی کے سپاہی اُنھیں دھکیل دھکیل کر گاؤں کے اندر لے جا رہے تھے۔

دنیا میری نظر میں تاریک ہو گئی۔ یہ بات اب بالکل صاف تھی کہ ہندی افواج کو ہر جگہ شکست ہو چکی۔ اب کچھ رہانہ تھا جس کے لیے جنگ کی جائے۔ ملازم کو تو میں نے وہیں

نہ تھا کہ اگر وہ موجود ہو تو میرے لیے سر پہچانے کی جگہ تھی۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ میرا دوست مجھے دیکھ کر رو دیا۔ کہنے لگا کہ دلو! یہ سارا گھر تھمدا ہے۔ جس طرح چاہو رہو، بس منہ نہ کھولنا ورنہ تھمادی ہوئی سے لوگ حسیں پہچان جائیں گے۔ میں مشہور کردوں گا کہ تم میرے چاچا کے لڑکے ہو۔ چاچا کی موت کے بعد ہمارے سے آئے ہو۔ دماغ کمزور ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتے۔

میں نے دونوں اوپری سکون سے گزارے۔ چاک کے کام کی جو مشق میں نے بچپن میں بہم پہنچائی تھی، میرے بہت کام آئی۔ باہر والوں میں کسی کو گمان نہ ہوا کہ میں پیدا کئی کھار نہیں ہوں۔

۱۸۶۰ء کا سال آتے آتے انگریزوں کی آفتش انتقام یکھ سرد پڑنے لگی تھی۔ بھاگے ہوئے لوگ واپس آرہے تھے۔ لیکن میرے یہاں کون تھا جو واپس آتا؟ مجھے خداے خلق کا شعر یاد آیا:

ساوَن ہرے نہ بھاووں ہی سو کئے ہم اہل درد

سہزہ ہماری آنکھ کا سیراب تھا سو تھا

کھار کے بھیس نے شاعری پڑھنا پڑھانا بھی مجھ سے جھڑوایا تھا۔ لگتا تھا اب دعو کی بے منت قرطاس و قلم ہی گزرے گی۔ لیکن ایک دن میرے دوست نے آکر خبر دی کہ دلو! سنا ہے کانپور میں انگریزوں نے توپ ہندو بنانے کا کارخانہ کھولا ہے۔ تم تو یہ کام بخوبی جانتے ہو، اور انگریزی بھی پڑھے ہو۔ اس وقت بھرتی زوروں پر ہے۔ زیادہ پوچھ کچھ نہ ہو کی۔ تم کھار کے کام کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ حسیں اس طرح من مار کر چیتے دیکھ کر میرا ہی کڑھتا ہے۔ تھمادی زمینیں ابھی انگریز نے ضبط کر رکھی ہیں۔ جب چھوٹیں گی تو میں تم کو خبر کروں گا۔

ہات دل کو گھٹی تھی۔ تھوڑے ہی دن بعد میں کانپور کے کارخانہ توپ و تفنگ کی بھرتی کے لیے لین ڈوری لگائے کڑھتا۔ بھرتی والے صاحب نے اتنا ضرور پوچھا کہ تم نے لڑائی میں کوئی حصہ تو نہیں لیا؟ میں نے سچ بچھ جواب دیا کہ بالکل نہیں۔ میں بھرتی ہو گیا اور

تھوڑے ہی دن میں میری کارکردگی کے باعث میری ترقی ہو گئی۔ مجھے کوئی افسر نما چیز بنا دیا گیا اور بتایا گیا کہ آج سے میں ”فورمین“ ہوں۔ تنخواہ اب معقول ہو گئی تھی۔ میں نے پریلے کے بازار کے پاس ایک چھوٹا سا گھر ڈھائی روپے مہینے پر لے لیا، ایک ملازم رکھ لیا، اور خالی وقت میں مختلف شعر و سخن کرنے لگا۔

اس وقت کانپور میں کوئی نای استوانہ قلم میاں رجب علی بیگ سرور بنارس جا چکے تھے۔ لکھنؤ سے آغا جہ شرف بھی کبھی آتے تھے۔ ورنہ محفلوں میں ہر شخص خود کو اُستاد ہی تصور کرتا تھا۔ میں نے مولوی عالم صاحب قلم کی صیحت کو گروہ میں باندھ لیا تھا کہ مبتدی کے لیے مقامی بیان ضروری ہے، نہ کہ تہذیب متوطن۔ لیکن کیا کرتا، میرا دل خیال بندی کی طرف پلکتا تھا۔ شیخ نافع نور مرزا نوشہ کا کلام درود زبان رہتا تھا۔ شیخ صاحب تو اس شہستان حیر و درود کے شب و درود کہنے کے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب مرزا نوشہ تھے اور میری تنہا کہ ان کی طرح کا شعر کہوں، ان کے پاس اٹھوں بیٹھوں، کچھ سیکھ کر واپس آؤں۔

مئی ۱۸۶۳ء کی بات ہے۔ ایک دن میں توپ خانہ بازار کی کوٹوالی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ نظامی پولیس کے مولوی عبدالرحمن حیر قندھاروں سے آتے ہوئے نظر پڑے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھکے، اور بولے، ”کو بھئی میاں، تم مرزا کا نام بہت چپتے رہتے ہو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں نے مرزا کا مکمل کلام ریختہ مطبع کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک چٹلی سی کتاب میرے سامنے کر دی۔ میں نے آخری ورق دیکھا تو واقعی مولوی صاحب کی طرف سے اعلان تھا، نور ان کی مہر تھی، اس امر کے ثبوت میں کہ یہ کتاب انھیں کی چھاپی ہوئی ہے۔ لکھا تھا، ”جناب مجمع لطف بے کراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضل ایموزی مطابق اس نسخے کے شہر ذی چہ ۱۲ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔“ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بکمال اشتیاق وہ نسخہ ان سے واپس خرید لیا۔ لیکن شروع کا صفحہ دیکھا تو صحت تمام کے دعوے کے باوجود قلمی نظر آئی، کہ دوسری ہی غزل پر (جس میں صرف ایک شعر

تھا) کوئی نمبر شمار نہ تھا۔ اس طرح غزلوں کی تعداد درست نہ رہ سکی تھی۔ لیکن میں نے مولوی صاحب سے کہا نہیں، کہ بے چارے غلط ہوں گے۔

اس دن سے دیوان غالب کا وہ نسخہ میرا شب و روز کا ہم و دوستان بن گیا۔ سنی چاہتا تھا کہ میں اس نسخے کی اشاعت کو مرزا نوشہ سے اپنی رسم و رول قائم کرنے کا وسیلہ بنوں۔ لیکن یہ کس طرح ہو، بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ انطباع کے بعد دیوان ہزاروں لوگوں نے دیکھا ہو گا، پھر میری کیا تخصیص تھی؟ اور یہ بات، کہ دیوان کانپور میں طبع ہوا، اور فی الوقت میں بھی کانپور میں تھا، میرے لیے تو ایک دلکش اتفاق ہو سکتی تھی، مگر میرزا صاحب کو اس سے کیا؟

اس اور جیلز بن میں کوئی ایک مہینہ نکل گیا۔ ایک دن میں نے پریڈ کے میدان کے پار میں ایک پادری کو دیکھا کہ لوگ اس کے پاس آ کر کسی کتاب پر اس سے دستخط لیتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ انتظار نہ معلوم ہوا کہ کتاب کا مصنف دیواری ہی ہے۔ لوگ اس کی کتاب خرید کر لاتے ہیں اور اس پر اس کے دستخط لے کر گویا اپنی قدر و قدر دہلی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے دل میں یک مرتبہ یہ بات گونجی کہ اگر میں بھی مرزا کے دیوان کے کچھ نسخے خرید کر ان سے دستخط کراؤں اور دوستوں کو تحفہ پیش کروں تو کیسی رہے؟ مرزا سے ملنے کا بہانہ بھی ہاتھ آئے گا، اور دوستوں پر مفت کرم و عاشقان کا بھی موقع رہے گا۔

پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ مہینے میں غلطی پر لیس جا کر دیوان کی بچیس جلدیں مول لیں۔ قیمت کچھ زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ آنے۔ پھر ہر کتاب کو بڑے اہتمام سے جلد کر لیا۔ ہر جلد پر چھ آنے صرفہ آیا۔ مولوی صاحب نے معمولی مشین کا فنڈ پر کتاب چھاپی تھی، لیکن انطباع روشن اور صاف ہونے کی وجہ سے کتاب بھلی معلوم ہوتی تھی۔

ایک مہینہ تو اسی جیس جیس میں گزرا کہ کتابیں لے کر جاؤں بھی پانچیں۔ کہیں مرزا صاحب برائے مان چائیں۔ بہر حال، بعض دوستوں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ جانا چاہیے، لیکن ذرا موسم بدل جائے، ہوا سرد ہو جائے اور سڑ آسان ہو جائے۔

چار مہینے میں نے ان مجلدات کو حرز جاں کی طرح بندھ کر رکھا۔ نومبر ۱۸۶۳ء کے

آخری دن تھے جب میں ہسپتال ڈاک قنوج، فرخ آباد، بیادور، کول، بلند شہر، غازی آباد، شاہد روہ، دلہائی ہوتا ہوا میں دن کی مسافت کے ہر جرح صریح جھیلتا، غم و الم اٹھاتا، دلی پہنچا۔ میں پاڑہ بند و راؤ کی ایک سرائی میں اترا۔ معلوم ہوا کہ ملی ماہوں کا علاقہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں۔ آہنی سڑک ابھی کانپور کے پاس سے بھی نہ گزری تھی، گو کہ اس کے آنے کے غلط تھے۔ میں نے بھی اب تک ریل کی سواری کی نہ تھی اور نہ اس کا ارادہ تھا۔ لیکن دلی کی ریل منزل میری سرائی کے پاس ہی تھی۔ وہاں کی چہل پھل، لوگوں کی دھکا پھل، دھواں و دھن، دھن دھن جھکتے ہوئے آتشیں انجنوں کا آنا جانا (اس لفظ سے میں کانپور میں آشنا ہوا)، مجھے یہ سب کچھ عجیب و وحشت انگیز لگا۔

شام ہو رہی تھی، میں نے دو کہاب داغ کروائے، ساتھ میں دو پراٹھے منگوائے، لیکن گھبراہٹ اور کلان سفر کے باعث کچھ کھایا نہ گیا۔ جلدی لیٹ رہا۔ صبح کو ہشیاہن سے استعصاب کیا تو اس نے کہا کہ ”میاں صاحب، ان نواب اور شاعر لوگوں کا دستور ہے کہ دن چڑھے اُٹھتے ہیں، پکھری دربار چاہتے ہیں، بڑے لوگوں سے ملنے ملتے ہیں۔ شام کو ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان سے ملاقات کا سب سے اچھا وقت دن ڈھلے چڑھ چلے ہے۔ مرزا نوشہ صاحب کا نام میں نے سنا ہے۔ وہ دلی کے تو ہیں نہیں، لیکن ہے ان کے طرز و طور اور رہے ہوں، لیکن اب تو وہ بھی یہیں کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ میں نے ایک آدمی بار اُٹھیں راجاؤں کی نگلی سے سواری میں گزرتے دیکھا ہے۔ تو میاں صاحب ابھی شہر کی سیریں کرو۔ شام میں ایک مشالچی ملازم اور گھوڑا سچس تمہارے ساتھ کروں گی۔ آرام سے مل کر چلے آئیے۔“

شام ڈھلنے کے ذرا پہلے میں نے لباس تبدیل کیا، پھلی کے چھکوں کی ٹوپی سر پہ بٹائی، اس پر رنگین بگڑی باندھی۔ کانوں میں موتی کے بالے ڈالے، ریشمی دھوتی کے نیچے پاؤں میں ہانے پہنے، جو دو چوری جوتیاں پہنیں۔ پھر ساز سیتھارنگا کر اپنے داوا سر حوم کی بٹائی ہوئی گھڑو کاٹھ سے لٹکائی۔ میں اپنے قریبی قصبے مبارک پور سے مرزا صاحب و قبلہ کے لیے دو ریشمی لٹکیاں اور دو ریشمی بگڑیاں بطور خاص بخوالایا تھا۔ میرے وطن نظام آباد کی مٹی

کے کچھ برتن، مثلاً چلیں اور فرشیاں بھی تھیں۔ ان کو خواں پر رکھوایا، اسی پر کتاہیں بھی رکھ کر سچیس کے حوالے کیں۔ مشاپلی کو آگے کیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔

اس وقت تک شام ابھی طرح پھول چکی تھی۔ اندھیاری کی بنا پر گری پڑی حلیوں اور لئے ہوئے بازاروں کے منظر پر ایک ذرا پردہ آگیا تھا۔ جامع مسجد پر بے فکر وں اور چٹوروں کا مجمع ویسے ہی تھا۔ افسوس کہ میرا سچیس اور مشاپلی دونوں ہی میداتی تھے، اور دتی میں نووارو۔ وہ بار بار رات کھوئی کرتے اور شہر کی تہلیوں پر الزام دھرتے۔ میرا سچیس خاص کر بڑا ہاتھنی تھا۔ ”میاں صاحب، دست اب کسے بھائی وے ہے، ملو بھائی بھی وے تو کیسے؟ مسجد سے راج گھاٹ تک اب لق و دق صحرا ہے۔ اینٹوں کے ڈمیر ہیں اور ان کے اندر ساپ بچھوڑیں کے مسکن۔ مرزا گوہر صاحب عالم کے باغ کی پھلی ست کئی پانس تھیپ تھا۔ اب وہ بچے کی چاندنی کے برابر ہو گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کشمیری دروازے سے لے کر کالی دروازے تک میدان ہی میدان ہے۔ پرانی گلیاں لوگوں سے اتنی پڑی ہیں، راستے کھوکھے ہیں۔ اٹکا جائے تو کہاں جائے؟ پنجابی کٹوا، دھوبی، واڑا، سداوت خان کا کٹوا، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی محلے مٹ گئے۔ گلیوں کی شکلیں بدل گئیں۔ میاں صاحب، اب یہ دتی دتی نہیں، ایک یکمپ ہے، ہارک ہے، اجاڑ گروں کا جنگل ہے۔ حضرت مرزا ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے میں یہ سب گلیاں اور بازار روشنی سے جھکا جھک تھے۔ اب ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا۔“ مجھے مرزا صاحب کا قطعہ یاد آگیا جو انگریز کے ڈر سے جنوز حطیح نہ ہوا تھا لیکن شدہ شدہ لوگوں کی زبانوں پر چری ہو گیا تھا:

گھر سے بازار کو نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

اور آج کی دتی کے بارے میں اپنے وقت کے ابلغ الملقا، اشعر، اشعر، خداے سخن حضرت

میر تقی کے کئی شعروں میں سے یہ شعر ذہن سے پھسل کر بے ساختہ زبان پر آ رہا:

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو رہا ہے

پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو پاں خرابا

میں نے دل میں کہا ایثار کرے کبھی دلی کے بھی دن بھریں۔ اسی جی ہو۔ تخت پر دلی برا ہے جس کا حق ہے۔

انھیں سب باتوں، راست و معوض نے اور ٹھو کریں کھانے میں دو کھینے صرف ہو گئے۔ مجھے غفلت ہو رہا تھا کہ مرزا صاحب بستر استراحت پر نہ تشریف لے گئے ہوں۔ اگر میری خبر پر انھیں اطمینان پڑا تو بڑی شرمندگی کی بات ہوگی۔ اور وہ مشائلی اور سچیں اسنے اسحق کہ انھیں کالے صاحب کا احاطہ ہی مل کے نہ دیتا تھا۔ مرزا صاحب کی حویلی کا ایک دروازہ عالم خاں کے کٹڑے کی طرف کھلتا تھا اور ایک کالے صاحب کی مسجد کی طرف۔ صدر دروازہ کالے صاحب کی خانقاہ سے ملا ہوا تھا۔ بارے خانقاہ کا پتا ملا تو حویلی بھی نظر آئی۔ ایک دو ملازموں کو باہر استفادہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ ابھی لوگ موجود ہیں۔

اطلاع کرائی تو فوراً ہی بلوایا گیا۔ دو حضرات پہلے سے موجود تھے۔ مرزا صاحب کا فضل شروع ہو چکا تھا، شاید حضار مجلس سے کسی قسم کا پردہ نہ تھا۔ ہائے میں مرزا صاحب کی شکل کیا جان کروں۔ کشیدہ قامت، متوسط بدن، لیکن ہڈ بہت چمکا، شانے اس عمر میں بھی خم سے آزاد۔ منہرا چھٹی رنگ، اس پر سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا۔ مسکراتا ہوا روشن چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن تھوڑے سے سرور کی وجہ سے سرخی مائل۔ آنکھوں میں شوخی اور فرست کی چمک۔ پورا چہرہ مہرہ اور قد و قامت بالکل کسی تازہ وارد توراتی کا تھا، بس ڈاڑھی ہندی طرز کی نہ ہوتی اور سر نہ منڈا ہوا ہوتا تو ایسے اچھوں کو یہی دھوکا ہو تاکہ کوئی آغاے توراتی ہے۔ ساری ڈاڑھوں کے گر جانے کے باعث دونوں گال ذرا پچک گئے تھے۔ یہ ایک کمی نہ ہوتی تو بھلا نہ سری کے باوجود وہ جاہت و حسانت مردانہ کا بہترین نمونہ قرار پاتے۔ آواز ان کی نہایت صاف اور کھلی ہوتی تھی۔ اکبر آبادی برج کی پچک اور منھاس لہجے میں اب بھی تھی، لیکن اس پر دلی کی کرشت ہوئی کی کہری۔ ہم بھی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ میری

پو رہی، بھونچ پوری کا ہلکا سا رنگ لیتی ہوئی آواز اور زبان کو بھلا کیا خیال کرتے ہوں گے۔

اور کیا خلقِ عظیم تھا، کیا شفقت تھی۔ انھوں نے لبِ قرش تک آکر میرا استقبال کیا۔

اپنے دست چپ پر بٹھایا۔ دست راست پر جو صاحب بیٹھے تھے، ان کا لباس منغل منصب و اردو کی طرز کا تھا۔ بڑے گھیر کا جامہ، اس کے نیچے قیمتی کپڑے کا زریہ جامہ۔ کمر میں رہیشی دوپٹہ، جس سے ٹخنہ جو اہر نگار و آب و ہوا آویزاں۔ سر پر زرعت کی جگ گوشتیہ ٹوپی، جو منغل طرز سے ذرا مختلف تھی۔ ڈاڑھی موچمیں گھٹی، موچمیں چڑھی ہوئی، ننگے دلو۔ ڈاڑھی بڑی صفائی سے ذرا چو کوری ترشی ہوئی۔ دہانے ہاتھ کی انگشت شہادت میں ایک بہت بڑی زمرود کی انگوٹھی، خانہ ماہر نگین کے کام آتی ہوگی۔ قاسلے کے باوجود گھٹنے پر کچھ کندہ کیا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا۔ انتہائی خوبصورت اور وجہہ انسان تھے۔ معلوم ہوا نواب ضیاء الدین خان صاحب نیر درخشاں ہیں۔ میں نے سر دقہ ہو کر تعظیم دی۔ انھوں نے مسکرا کر سلام لیا اور دعائی، ”خوش رہیں، آباد رہیں۔ دولت و اقبال زیادت ہا۔“

جو بزرگ مرزا صاحب کے سامنے تشریف فرما تھے ان کی ڈاڑھی موچمیں بہت گھن کی تھیں، کنگھی کی مشاطگی سے آزلو، بالکل چنپا کا جھونجھ لٹتی تھیں۔ سر پر اونچی دیوار کی مٹلی ٹوپی، بدن پر انگریزی وضع کا بھاری کوٹ، نیچے موٹا اونٹنی کرتا، اسی کپڑے کا ڈھیلا پاجامہ۔ جہنم آکھیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے خاص شاگرد خشی شیو نرائن آرام ہیں۔ انگریزوں سے بغرض ملاقات و علاج تشریف لائے ہیں۔ میں نے پھر سر دقہ ہو کر تعظیم دی۔ انھوں نے بھی تقریباً انھیں الفاظ میں دعائی جو نواب ضیاء الدین صاحب کی لسان مبارک سے ادا ہوئے تھے۔

مرزا صاحب نے فرمایا، ”مہاں، خاندان بے تکلف ہے، بتاؤ کچھ شغل بھی رکھتے ہو؟“

میں نے دہلی زبان سے جواب دیا۔ ”حضور، راجپوت ہوں، برت بھی دو آٹھ کتاب سے کھولتا ہوں۔“

مرزا صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ شیو نرائن صاحب آرام نے حسین

کی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ نواب صاحب نے ارشاد فرمایا:

”میاں صاحب ذرا ہے، یہ تو تم نے ہمارے قبلہ مرزا صاحب کا شعر پڑھ دیا۔“

میں بات کو بھانپ گیا کہ اشارہ کس طرف ہے اور میں نے فوراً مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

فلت نکر کہ در حیاتم نہ پائستد

جز روزگار درست پہ سپہا کشود

پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، ”یہ درمیشد کی کرامت ہے کہ ایسا جواب بن پڑا۔“

یہ درمیشد لسان الغیب کا درجہ رکھتے ہیں۔“

اس پر سب لوگوں نے کہا ”بے شک، بے شک۔“

مرزا صاحب نے کلو دار دھ کو آواز دے کر میرے لیے میلا اس اور نقل منگوائی۔ پھر

غایت سفر پوچھی۔ میں نے مختصر عرض کر کے سب سے پہلے تو وہ نگلیاں اور پکڑیاں نذر

کیں۔ میری خوش نصیبی تھی کہ پکڑیاں ان کی پسند کے مطابق نکلیں۔ انہوں نے فرمایا،

”بہت خوب، بہت خوب۔ مجھے عمامے میں سرخ رنگ بالکل پسند نہیں۔ اچھا ہوا ان عماموں

میں کوئی بھی سرخ دھکا نہیں ہے۔“ میں نے جبکہ کر تسلیم کی، پھر چلمیں اور فرشیاں پیش

کیں۔ بالکل سیاہ مٹی، اس پر دو پہلا کام بنا ہوا۔ یہاں دالوں کے لیے ٹی چیز تھی، بہت پسند کی

گئی۔

نواب صاحب اور منشی صاحب تو رخصت ہوئے، میں مرزا صاحب قبلہ کے ساتھ

شعل سے دینا کر تار ہا۔ کوئی دگریزی شراب تھی، بالکل بے رنگ، اور بہت تیز۔ غالباً شام تک

رہی ہو۔ رات جب بہت بھیک چلی تو میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا:

”دیر ہوتی ہے، جاؤ بھی جاؤ۔ میں بھی کچھ خن فکر کروں گا۔ بے بے، مجھے اپنی جوانی کا

شعر یاد آگیا:

فکر خن یک انشا دعا فی غموش

دو چراغ کویا زنجیر بے صدا ہے

لیکن اب میں بھی زیادہ جاگتا نہیں۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی:

”حضور، جب اس کلام میں ایسے ایسے شعر تھے تو اس پر خط متخیج پھیرنا کیوں کو اور کیا؟“
جیسے ایک دم کو وہ چپ ہو گئے۔ میں ڈرا کہ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ لیکن پھر وہ کچھ دھیسے
لہجے میں بولے، ”میاں، اس بڑھاپے میں اقبال کرتے شرم آتی ہے، لیکن اس کلام کو رد
کرنے کا رنج مجھے بھی ہے۔ کہنے تو میں کہہ گیا کہ میں لڑکپن میں بے روارہ تھا۔ بے مطلب
کہتا تھا۔ جب کچھ قہیز آئی، وہ اور اتنی یک قلم چاک کیے اور چند شعر واسطے نمونے کے دیوان
حالی میں رہنے دیئے۔ لیکن اصل بات سلاست روی فکر اور سلاست بیان کی نہ تھی۔ میری
نوجوانی تھی، میں سمجھتا تھا کہ شعر، سننے سنانے سے زیادہ، پڑھنے پڑھانے کی شے ہے۔ پھر
مرزا عبدالقادر بیدل کا قول دل میں جا گزریں تھا کہ زبان اور معنی میں مفاہرت ہے، زبان کو
معنی کا قتل نہیں۔ مرزا بیدل فرماتے ہیں:

اے بسا معنی کہ از نامحرمی ہے زبان

با ہر شوخی مقیم پردہ ہے راز ماند

لیکن میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں شعر سننے کا رواج زیادہ ہے، پڑھنے کا کم۔ اور زبان کو
میرے معنی سے یوں ہی پردہ تھا۔ میں بات اشاروں اشاروں میں کہتا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ
تھا۔ ایک دن طبیعت مجھ بھلائی تو انھی۔ میں نے دل میں کہلاپہ ریتے کہوں گا ہی نہیں، فارسی
کھسوں گا۔ دوستوں کو خوش کرنے کے لیے اعلان کر دیا کہ ریتے زیادہ تر مسترد کر کے صرف
منتخب اور آسان کلام داخل دیوان کروں گا۔ حالانکہ جو کلام چھوڑ دیا تھا، اس میں بھی نام نہاد
آسان کلام کی کمی نہ تھی۔ انتخاب کیا گیا، بس ایک دو پہر کو ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے
کچھ سرخوشی کے عالم میں جہاں چاہا قلم لگا دیا۔ ورنہ جن غزلوں پر یہاں لوگوں نے مجھے استاد
بانا، وہ بھی زیادہ تر اس زمانے کی کہی ہوئی ہیں جب میری عمر بچپن سے تھی۔

”اب اس کلام کی بازیافت کی کوئی امید نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ فرمایا، ”مجھے اپنا کلام
بہت کم یاد رہتا ہے۔ تازہ کلام بھی بھول جاتا ہوں۔ اور ان اشعار سے تو اب قیامت ہی میں
ملاقات ہو گی۔“

میں نے اردو خوشی میر کا شعر پڑھا دیا:

قیامت کو جہان شاعری پر

مرے سر سے میرا ہی دیوانہ مارا

مسکرائے، فرمایا، ”تو آپ بھی میری طرح میری ہیں۔ لوروں کی طرح سو دلتی نہیں۔“ میں نے اس پلڑے کو ہٹا دیا۔ فقرے پر سبحان اللہ کہا اور عرض کیا۔ ”اب اجازت مرحمت ہو۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ میر و مرشد مجھے کسی ایسے وقت طلب فرمائیں جب تھکے ہو؟“ اصل میں مجھے کتابوں پر دستخط کی فرمائش کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ امید تھی کہ رات بھر میں ہمت بنالوں گا۔

کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، ”اچھا تو میاں تم کل دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤ۔ اس کے بعد میں ڈرائیٹ رہتا ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تمہارے لیے وہی وقت نکال لوں گا۔“

مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہ پڑی، حالانکہ ان کے آرام میں خلل انداز ہوتا سخت شاق تھا۔ آداب کر کے سر اٹکے واپس چلا آیا۔

اگلی صبح طبیعت کسل مند تھی، دیر سے اٹھا۔ تیار ہوتے ہوتے بارہ بج گئے۔ میں تنہا ہی سو رہا ہو کر ٹیلی فون کو چلا۔ راستے میں ہر جگہ گزشتہ جرنیلی نظام کی وردنک نشانیوں اور آہنی سڑک کے واسطے مزید انہدام کی تیاریاں نظر پڑیں۔ میں نگاہ جھکائے چلتا گیا۔ اس بار راستہ بدھولا۔ مرزا صاحب کمال شفقت سے میرے منتظر تھے۔ میرے جاتے ہی کھانا لگا۔ مرزا صاحب کے لیے انتظام کوور سادہ کہ بقدر اشک بلبل، اور میرے لیے وافر اور متنوع۔

کھانے کے بعد میر و مرشد نے انگنائی میں دھوپ سے ڈرائیٹ کر اپنا پلنگ بچھوایا، میرے لیے ایک چھوٹی سی مسند لی بچھائی گئی۔ ہینڈ آئزرہ کیا گیا۔ مرزا صاحب اپنا بیچہ ان کبھی کبھی مجھے لولوش فرماتے۔

جب ہینڈے کا لطف لے چکے تو مرزا صاحب نے فرمایا، ”ہاں صاحب، اب کھوہا بھلیکے۔“ میں نے کتابوں کی گھڑی کھولی، اور ایک کتاب ان کی طرف بڑھا کر کچھ کہنے ہی

والا تھا کہ انھوں نے کتاب کھول کر کہا، ”یہ تو میرا ہی دیوان ہے۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا؟“

میں نے عرض کیا، ”اس کی حاضری کا مقصد کچھ اور ہے۔ ملتس ہوں کہ حضور ان جلدات کو اپنے دستخط سے مزین فرمائیں۔ میں انھیں نذر دوستاں کر دوں گا، اس سے بہتر تحفہ دینی کا کیا ہو گا۔“

”مگر بھائی، میں دستخط کیوں کروں؟ یہ کتابیں میری ملک تو ہیں نہیں۔“
میں نے اتنا اس کیلئے ”ساحبان مالیشان کے یہاں یہ طریقہ مصنف کی قدر شناسی کا رائج ہے کہ کتاب پر مصنف ہی سے دستخط کرا لیتے ہیں اور اسے بڑا قیمتی تحفہ قدر دانوں کے لیے جانتے ہیں۔“

مرد صاحبِ نفس، ارشاد ہوا۔ ”ہم تو یہ جانتے تھے کہ مصنف کی قدر دانی ظاہر کرنے کے لیے اسے سات بلکہ چودھار بچے کا خلعت پہناتے ہیں مائیکس رقوم جواہر کی مالا اور سات عدد کاجیہ زیب گردن دوسر کرتے ہیں۔ نصف روپے کی کتاب مول لے کر اس پر مصنف کے دستخط لینا اور کتاب تقسیم کرنا کون سی قدر شناسی ہے۔ خیر لاؤ، تم کہتے ہو تو اپنی مہر کے دینا ہوں۔“

حسن اتفاق کہ ابھی ۱۲۷۵ھ میں نئی مہر بخائی ہے۔ ”یہ کہہ کر انھوں نے دارودہ کلو سے قلم دان مانگا، ہر کتاب پر اپنے دست مبارک سے مہر کی۔ چاندی کے تکیے کی چھ کور مہر تھی۔ پھر کچھ سوچ کر ایک کتاب پر لکھا:

برخوردار جنی باد صحرے سحرے رسوا

اے آمدنت باعث دل شادی ما

اسد اللہ خان غالب لکاشتہ ۱۲۷۶ ربیع المرجب ۱۲۷۵ھ

کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے، ”اب تو خوش ہو۔“ میں نے سر دقہ ہو کر کتاب ان کے ہاتھ سے لی، آنکھوں سے لگائی۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اجازت چاہی کہ آرام میں نکل نہ ہوں۔ ارشاد ہوا، ”کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔ مجھے حصار الجہاں چھانگنا ہے۔ اور تم

نے یہ تو بتلایا ہی نہیں کہ شعر کب سے کہتے ہو۔ صاحب دیوان ہو کہ نہیں اور کس کے شاگرد اس فن میں ہو؟“

میں نے اپنے استاد مولوی خدام حسین ناظم اور ان کے دلو اطا سابق بھاری کا ذکر کیا۔ فرمایا، ”مولوی ناظم صاحب سے تو شرف ملاقات نہیں، لیکن ملا سابق علیہ الرحمۃ سے واقف ہوں۔ ان کی مثنوی ”تا شیر محبت“ میں نے اپنے بھارس کے قیام دیکھی تھی۔ بڑے جید آدمی تھے۔“

میں ان کی خدمت میں کچھ گستاخ ہو چلا تھا، شاید اس لیے کہ انہوں نے مجھے کچھ منہ بھی نکالیا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

”خیر و مرشد، جان کی امان پاؤں۔“

ایک بار مجھے انہوں نے غور سے دیکھا، فرمایا، ”کہو کہو، کیا بات ہے؟“

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ”حضور کی رائے ہندوستانی فارسی گو یوں کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ لیکن آنجناب تو خود بھی ہندوستانی ہیں؟“

ان کا چہرہ تھوڑا سرخ سا ہو گیا، لیکن پھر بھی انہوں نے نرمی سے فرمایا، ”فارسی زبان کے رموز و خواص میں میری روح میں یوں بوجہ ست ہیں جیسے فولاد میں جوہر، یار گہ گل میں ہاد، سحر گاہی کا نم۔ میں کہاں اور یہ غیاث الدین رامپوری اور دلولالی سنگھ قاتل فرید آبادی کہاں۔ ان کے اجداد نے بھی کبھی ایران نہ دیکھا ہو گا۔“

”لیکن حضور اور بھی تو ہندی شعرا ہیں۔ امیر خسرو، علا فیضی، ملا غنی کا شیرازی، ابو البرکات منیر یہ لوگ تو غیاث و قاتل جیسے نہیں۔“

اب ان کے لہجے میں ذرا نرمی آگئی۔ ”کل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم اثنیوث نہیں، کچھ؟“ میں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ ہاں غنی لود منیر اور خود فیضی اچھے شاعر ہیں، معنی یاب ہیں، لیکن زبان سے ان کو کیا علاقہ؟“

میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ زبان اور مضمون تو ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں، پھر یہ کیوں کہ ہوا کہ کوئی معنی یاب ہو لیکن زبان خراب لکھے۔ مگر اتنی بڑی گستاخی کی ہمت نہ

تھی۔ میں نے سوچا بیدل کے پردے میں بات کریں۔ کل بیدل کا ذکر آ بھی چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”حضور ایک زمانے میں تو میرزا بیدل کے بڑے مداح تھے۔۔۔“

میری بات کاٹ کر یوں لے، ”مداح اب بھی ہوں، لیکن ان کی زبان کا نہیں۔ بیدل اور ناصر اور فہیمت، ان کی فارسی کیا۔ ہاتھ نکلن کو آری کیا۔“ انھوں نے لیان کو آواز دی کہ بھنڈا وہ پادہ تازہ کرو۔ میں نے رکتے رکتے عرض کی، ”ڈار تاہوں جس طرح حضور ان شعر کو ایوان شعر سے خارج فرما رہے ہیں، کہیں آپ کے ساتھ بھی زمانہ وہی سلوک نہ کرے۔“

یا تو لیٹے ہوئے تھے یا سر ڈا صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا، ”یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی زبان کی زمام میرے ہاتھ میں ہے، طبع میری سلیم ہے اور ذوق میرا درست۔ اور میرے مضامین تو ایسے ہیں کہ لوگ انھیں رہتی دنیا تک پڑھتے اور دیکھتے پھریں گے۔ ابھی یہ دہل بند کیا جا نہیں گئے اور کیا سمجھیں گے۔“

پھر انھوں نے اپنا شعر پڑھا:

پایۂ من جز بہ چشم من نیاید در نظر

از بلندی احترام روشن نیاید در نظر

خدا کی قسم، وہ وقت اور وہ ماحول، وہ اُن کے چہرے پر بادشاہوں کا سا جلال۔ اور مضمون کی وہ عذرت، کلام کا وہ زور، میں پھر کب ہی تو کیا۔ (اس واقعے کے برسوں بعد کسی انگریزی اخبار میں دیکھا کہ بہت سے ستارے ہم سے اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک بہت دیر لگتی ہے اور بہت دیر میں پہنچتی ہے، اور حالے کہ اصل میں وہ بے حد چمک دہر ہیں۔ تب مجھے ان کا یہ شعر یاد آیا۔ میں نے دل میں کہا، بے ہنگو ان، کیا سر ڈا صاحب کو علم غیب تھا جو ایسے مضمون باندھ لیتے تھے)۔ لیکن اس وقت تو مجھے ان کو پیچیز نا اور ان سے کچھ سیکھنا منظور تھا۔ دل کھول کر اس شعر کی دہر دینے کے بعد میں نے کہا ”قبلہ و کعبہ، غنی کے تو میرزا صاحب بھی قائل تھے۔“

”ابھی صاحب دلوں، صاحب کیا اور ان کا فیصلہ کیا؟ اہل ہند کے درمیان رہتے رہتے ان کی زبان خود غیر معتبر ہو گئی تھی۔ وہ میرانی نزلت تھے مگر اردو شا جہاں آباد تھے۔“ انتقام کشیدن“

اور ”انتظام کر فتن“ دونوں بول گئے۔ ”انتظام کر فتن“ ترجمہ ہے ہندی محاورے ”انتظام لینا“ کا۔ فارسی میں غلط مبالغہ غلط۔“

”مگر جیو و مرشد، اگر صاحب کی زبان مشکوک ہے تو عربی کو کیا کہیں گے؟ انہوں نے بھی تو عمر کا بڑا حصہ اکبر آباد میں گزارا؟“

”ہے۔ ہے۔ عربی کا نام تم کیوں سچ میں لائے۔ دو ہزار اصطلاح ہے، ہم اس کے مطیع ہیں۔ وہ جو بھی کہے سب درست۔“

میں نے درست سے میں جو تھوڑی سی منطق پڑھی تھی اس کی رو سے قبلہ و کعبہ کی یہ بات مجھے سربینا غلط معلوم ہوتی تھی۔ لیکن مجھے ان سے مناظرہ تو کرنا نہیں تھا، بہت کم حاصل ہی کرنا تھا۔ لہذا میں نے کہا، ”حضرت، انان آرزو تو فرماتے تھے کہ جس طرح ایرانی صاحبان قدرت کو زبان میں تصرف کا حق ہے، اسی طرح ہندوستانی صاحبان قدرت کو بھی ہے۔“

”مگر اہل ہند میں صاحبان قدرت ہیں کہاں؟ کیا تم قبیل کو صاحب قدرت کہو گے جو ’ہند جاہد عالم‘ کو غلط بتاتا ہے اور ’پچھانہ بود‘ کی جگہ ریختہ کا محاورہ ’خاک نہ بود‘ لکھتا ہے؟“

”حضرت، اہل ہند میں اور بھی لوگ ہیں۔ اگر امیر خسرو اعلیٰ اللہ مقامہ ’مسلم الثبوت‘ ہو سکتے ہیں تو بیدل کیوں نہیں؟ اہل ہند پان سو برس سے فارسی لکھ بول رہے ہیں، کیا ان کی فارسی اپنی جگہ مستحکم نہ بنی جائے؟ آخر سب ایرانی استاد بھی تو شیراز و اصفہان کے نہ تھے۔ کوئی چلتی ہے، کوئی غرضنوی، کوئی بخاری، کوئی گنجوی۔“

”دیکھو دیکھا کرنے کی بات اور ہے۔ ورنہ سید محمدی خدا انگشتی یہی ہے کہ اہل ہند کو فارسی نہیں آتی۔ میر اسحاق اور ہے۔ اس زبان سے لڑنی وہ بھی مناسبت کے علاوہ میر انوار ایک ایرانی استاد بھی تھا جس نے مجھے یہ زبان کو یا گھول کر پلائی دی تھی۔“

اتنا کہہ کر وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گئے۔ شاید تھک گئے ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ شاید میں حد سے آگے نہ بڑھ گیا ہوں۔ میں اجازت کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ انہوں نے آنکھیں بند کیے کیے فرمایا:

”اہل ہند کی فارسی پر ان کی اپنی زبانوں کا اثر لا محالہ پڑا ہے، خواہ ہندی، خواہ بھاکا۔ اس

لیے ان کی قادی میں یہ انیت نہیں۔“

”لیکن حضرت والا یہ بھی تو خیال فرمائیں کہ جس قوم نے خسرو، فیضی، غنی، بیدل، بہار جیسے لوگ پیدا کیے ہوں، اس کا بھی تو قادی زبان پر حق ہو گا؟“ میں نے ذرا زور دے کر کہا۔
 ”تم ان باتوں کو نہ سمجھو گے۔ بہار نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور صحیح کیا ہے۔ لیکن جہاں وہ بھی اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ اہل زبان کے معاملات اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔“

”گستاخی معاف، پیر دہر شد میں تو بھی سمجھتا ہوں کہ بہار اور برہمن اور بیدل جو دن رات قادی بولتے لگتے اور سوچتے تھے، انھیں اہل زبان کہنا چاہیے۔ میں اپنا خدشہ بھر عرض کروں گا کہ حضرت والا اگر اہل ہند کی قادی کو برا کہتے رہے تو مبادا لوگ آپ کی بھی قادی کو غیر معتبر کہہ دیں۔“

انھوں نے لمبی سانس لی اور بولے، ”آخر پہنچے ہو، اور راجپوت پہنچے ہو۔ تمہاری ضد کا علاج میرے پاس نہیں۔ اب جاؤ، میں کچھ دیر آرام کروں گا۔“

میں سر سے پاؤں تک لرزہ لڑی تو اٹھا کہ میں نے اس فرشتہ خصال بزرگ کو خفا کر دیا۔ میں نے ان کے پاؤں بکڑ لیے اور سر جھکا کر کہا، ”یہ نیچے حاضر ہے۔ اسے میرے سینے میں اتار دیجئے لیکن لنگہ خفاندہ ہوئے۔“

مرزا صاحب نے تقریباً سرکوشی کے انداز میں کہا، کوہا اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔
 ”تنگی کی کوئی بات نہیں۔ ہاں، مومن خاں کیا خوب کہہ گیا ہے:

تا توئی سے دم زکے تو زکے

میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

”میں صاحب، میں خفا نہیں ہوں۔ اپنی تقدیر پر افسردہ ہوں کہ اس دیار سے، اس ملک سے، قادی کا ذوق اٹھتا جاتا ہے:

”غالب سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری

بہ دیدارے کہ نہ دانند نظیری ز قاتل“

مجھ سے کچھ جواب نہ بنا پڑا، بس دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ میں نے بے سبب ان کو افسردہ کیا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد انہوں نے فرمایا: ”ہاں سوسن خاں کچھ ہمارا دم نہ پاں تھا۔ اس کا ہندی شعر اس وقت خوب یاد آیا۔ یہ شخص اپنی بد شمع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔ اچھا سماں تم اب جاؤ۔ فرست ہو تو کل بھی اسی طرح آ جاؤ۔“

میں ”بہر و چشم حاضر ہوں گا“ کہہ کر رخصت تو ہوا، لیکن راستے بھر خود کو فخر میں کرتا رہا کہ میں مرزا صاحب سے بحث میں کیوں الجھا۔ دوسری طرف یہ سوچ کر بھی میں کم رنجیدہ نہ تھا کہ مرزا صاحب جیسا روشن دماغ شخص اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ جب کوئی زبان اپنے ملک کے باہر بکھلتی ہے اور غیر ملک والے مدت مدید تک اس میں سلسلہ شعر و نثر و حرف و سخن جاری رکھتے ہیں تو غیر ملکوں کی زبان، اور غیر ملک سے آئی ہوئی زبان میں تغیر لازمی ہے۔ اور کسی ملک میں جب کوئی غیر زبان قائم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس ملک کی بھی ہو جاتی ہے۔ آخر انگریزی بھی تو ہے کہ ہمارے ملک میں تیزی سے مستولی ہوتی جاتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو سو دو سو برس میں ہندوستانی لوگ بھی انگریزی میں صاحبِ قدرت ہو جائیں گے۔

دہی دوسری بات، کہ ہیدل، غنی وغیرہ کو تسلیم نہ کر کے مرزا صاحب قبلہ اپنی بھی نامعتبری کی بنیاد قائم کر رہے تھے، تو میں ذرا آگے کی بات یہیں بیان کر دوں کہ ان واقعات کے کئی برس بعد میرے والد اؤسٹا مولانا فاروق چچا کوئی کے براہ راست اور بڑے ہونہار شاعر و مولوی شبلی صاحب ہوئے۔ انہوں نے شعر فارسی کی تاریخ پانچ جلدوں میں لکھی۔ یہ جلدیں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء شائع ہوئیں۔ (آخری جلد ان کے انتقال کے بعد چھاپے خانے سے آئی۔) میں نے بڑے شوق سے وہ جلدیں عبد الاشاعت منجائیں کہ دیکھوں ان میں ہمارے میرزا صاحب کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہاں میرزا صاحب تو کیا، ہیدل اور غنی اور سرخوش اور خان آرزو کا بھی ذکر نہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ شبلی صاحب کی نظر میں میرزا غالب وغیرہ مستحق نہ تھے۔

دوسرے دن میرزا صاحب کے وہاں جانے کے لیے میں فتح پوری کے ہاڑا فواکھ سے گزر رہا تھا کہ دیکھا سارا ہزار کاٹل کے عمدہ انگوروں سے چنچا رہا ہے۔ میں نے ایک بڑی جھابی انگوروں کی مزدور کے سر پر رکھوائی۔ مرزا صاحب کی طبیعت اس وقت بحال نظر آئی۔ شاید وہ خفیف سا ٹکڑا، جو میری محنت بجٹی سے پیدا ہوا تھا، زائل ہو چکا تھا۔ انگوروں کو کچھ کر دہ خوش تو بہت ہوئے، لیکن ان کا مرغوب میوہ اور ہی بات رکھتا تھا۔ فرمایا:

”بہت عمدہ پھل لائے۔ بچوں کے کام آئیں گے۔ ایک دو دانے میں بھی کھالوں گا۔ لیکن کاش کہ ہر موسم آم کا موسم ہوتا۔ میں نے اپنی مثنوی میں کہا ہے:

آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے چلے پیچھولے تاک

اس میں اور شعر بھی مزے کے ہیں۔“ میں ابھی اس شعر کی مناسبتوں اور حسن تعلیل کی داد کے لیے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ مرزا صاحب نے فرمایا، ”اور میں انگور تو مفتی آذر دہ وغیرہ جیسوں کو کھلاتا ہوں۔ کچھ سمجھے کیوں؟“

امتحان نیز حاتھا، لیکن ماں سر سوتی نے لاج رکھ لی۔ معاً میں نے مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

داہد از ما خوش تاج کے چشم کم نہیں
ہی نمی دانی کہ یک پیانہ نقصان کردہ ایم

اللہ ان کو کر وٹ کر وٹ جنت نصیب کرے، میرزا صاحب مسکرائے، فرمایا: ”آدمی خوش ذوق ہو تو تھماڑے جیسا ہو۔ شام کو آتے تو میں حصیں لیکور پلاتا، کہ اس کا لطف بھی آم ہی جیسا ہوتا ہے۔ رنگت کی بہت خوب، قوام کی بہت لطیف، طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا پتلا قوام۔ اور یہ ہندوستانی گڑ چھال کی چھنی ہوئی شراب مجھے بالکل پسند نہیں۔“

[”لیکور“ کسی خاص شراب کا نام نہیں۔ ہر وہ شراب جس میں اکھل ہو، اور جو کھانے کے بعد پی جائے، Liqueur کہلاتی ہے۔ سب لیکوریں بہت چیز، خوشبودار، اور ’میشی‘ ہوتی ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ کا تلفظ یوں کرتے ہیں کہ لائل نکسور ہے اور واؤ معروف۔ غالب نے بھی یہی تلفظ کیا ہو گا۔ الغلب ہے کہ ان کی مراوشار تروز (Chartreuse) سے

ہو جو اس زمانے کی مقبول فراہمی کیور تھی۔ اس کارنگ زردی مائل سنہری لٹاکارو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آم کے عرق سے اس کی متابعت ظاہر ہے۔ دوسرا مکان یہ ہے کہ غالب نے لفظ کیور سے ایسی براہی مراد لی ہو جس میں کیور ملا کر اسے خوشبودار کیا گیا ہو، مرتب۔ اب تک کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے بعد دھن سے ہاتھ دھوئے گئے۔ پھر اسی طرح آنکھائی میں چنگ اور منڈلی کا اہتمام ہوا۔ ہنڈے کا دور چلا اور ہاتھیں شروع ہوئیں۔ میں نے عرض کیا:

”قبلہ و عقبہ نے کل جو حکیم مومن خاں صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ طبیعت ان کی معنی آفریں تھی، اس پر کچھ مزید ارشاد ہو۔“

خطی سانس بھر بولے، ”ہاں صاحب، وہ لوگ بھی خوب تھے، اور گوراشاہی کے پہلے کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اب نظام الدین مضمون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آذر وہ اور ایک میں، دونوں جینے سے بچا رہا۔ نہ خن دہری ہے نہ خن دانی، خیر، سنو، پرانے بزرگ معنی آفرینی سے مراد لیتے تھے کہ شعر میں کوئی نئی بات ہو، کوئی نیا مضمون ہو، کسی پرانی بات کا کوئی نیا پہلو ہو۔ ورنہ سامنے کی بات تو سب کہہ لیتے ہیں:

دعا ان تو جملہ در وہاں
پشمان تو زیمہ ابرو داند

کہنے میں کوئی مزہ نہیں۔ یہ کوئی کمال خن دہری نہیں کہ قافیہ سامنے رکھ لیا اور جس قافیے نے جو مضمون بھلیا، بے کھٹکے نظم کر دیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے۔“

تھوڑے سے سکوت کے بعد انھوں نے یہ دو شعر پڑھے جو شوق و ذوق سے پڑھے:

عشرت ماسنی ہزک پہ دست آوردن است

مید مانازک خیالوں را ہلال این است و بس

ی نجم در زیر پای فکر کرسی از سپہر

تا بکف ی آورم یک معنی بر جست را

اور فرمایا: ”میاں سنتے ہو۔ پہلا شعر صائب کا ہے، دوسرا کلیم دہرائی کا۔ یہ خیال تازک کیا ہے؟ ایسا خیال جو لطیف اور ہار یک ہو، جو بیان میں آسانی سے نہ آئے۔ اور جب بندہ جائے تو شعر کے اپنے لفظوں کے سوا کسی اور عبارت میں بیان ہو تو وہ بات نہ رہ جائے۔ اسی کو ابوطالب کلیم معنی برجستہ کہتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے آسان کی بلندی پار کرنے جیسی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ معنی ایسے ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آئے تو آئے، ورنہ چھوٹ گئے تو چھوٹ گئے۔ فقیر نکیہ نشین غالب کے یہاں ایسے مضامین کی کثرت ہے، کہ جب کوئی مضمون باندھ لیتا ہے تو خود دہک رہا ہے کہ کیسے اس ہمارے بلند نشین کو بکڑا۔“

میر نے صفحہ سے بے ساختہ نکلا:

آب بود معنی روشن فنی
خوب اگر بت شود گوہر است

میرزا صاحب ایک لمحے کو ٹھکے، پھر فرمایا، ”ہاں اچھی بات کہی۔ تازک مضمون بہتا ہو پانی ہے، مٹی میں نہیں آسکتا۔ آجائے تو گوہر ہی کہلائے۔ معنی روشن سے مراد ہے وہ مضمون جو اپنی تازگی کے باعث صدف سے تازہ لگتے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہو۔“

”سبحان اللہ کیا تعبیر ارشاد فرمائی،“ میں نے کہا۔

فرمایا: ”خیال بند شاعر وہ ہوتا ہے جو نادر مضامین کی تلاش میں دور دور نکل جانے کی جرأت کر سکے۔ سب سے پہلے خیال بند میاں شاہ نصیر تھے۔ لیکن جس شخص نے اس فن کو معراج پر پہنچایا وہ شیخ ناسخ تھے، کہ تمام شروع سادہ کے ناسخ ہی تھے۔ ہم سب نے خیال بندی انھیں سے سیکھی۔ ہاں ان کے کلام میں درد مندی کی وہ کیفیت نہیں جو میر کا خاصہ ہے۔“

”پھر خیال بند شاعر کھل متبع توند کہ سکے گاشایہ“ میں نے پوچھا۔

ارشاد ہوا، ”ہاں۔ مگر بعض لوگ سمجھا بھی لیتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوا ہوں۔ لیکن خالص خیال بندی کے ساتھ کھل متبع اور درد کیفیت کا جو زور اصل ہے نہیں۔ ان دنوں خیال بندی کا جہاں اسی لیے کم ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے کانپور کے پڑوس

میں لکھو ہے۔ وہاں ہماری طرف اور طرح کا ایک شاعر ہے، اسی نے آج کل خیال بندی کا چراغ خوب روشن کر رکھا ہے۔“

”قائدِ آفتاب کی مراد نواب امیر علی خان قسیم دہلوی سے ہے“ میں نے عرض کیا۔
 ”ہاں اور آدمی وہ بڑے غلطیے والے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔“ انھوں نے فرمایا۔
 ”تم نے ان کا شعر سنا ہو گا:

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں
 کچھ ہو نہیں سکتی غزل عاشقانہ فرض

میں بھی کہتا ہوں کہ نرے مضامین ہجرتِ دو سال کے ورے بھی تو کچھ ہو گا۔ اسے کیوں نہ ٹٹولا جائے۔ نظیری کیا خوب کہتا ہے:

ہزار رنگ دریں کارخانہ درکار است
 مگر کتبہ نظیری ہمہ کتبہ مستعد

تو میاں، دنیا تو بہت بڑی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ چشمِ تنگ کو داکریں۔“
 مجھے قبلہ و کعبہ کا شعر یاد آگیا:

حد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
 کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے دا ہو

انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ ”شعر تو آپ کو خوب یاد ہیں، لیکن دیکھیے کہیں رسوائے رسواں بازارد ہو جائے۔ غالب کے چاہنے والے بہت ہیں، لیکن اس کا نہ اچانے والے بھی کم نہیں۔“

میں نے کہا، ”جناب والا کو چارک و قناتی نے محسودِ خلایق بتلایا۔ اس کی قیمت تو لوہی کرنی ہو گی۔“

میرزا صاحب چپ ہو گئے۔ مجھے ہر اس ہوا کہ زیادہ بے تکلف تو نہیں ہو گیا۔ لیکن وہ کسی سوچ میں تھے۔ میں بھی دم سادھے رہا۔ انھوں نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا۔ ارشاد

ہوا، ”جمعیت کم، تفرق زیادہ۔ خود داری اور کبر نفس اور استغنا، یہ سب خدا دل مجھ میں ہیں۔ پھر دکھ کیوں نہ اٹھائیں۔ میرزا بیدل کہہ گئے ہیں:

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

لیکن چارہ نہ داشتن کے مضمون پر مجھے بیدل کا یہ شعر بہت اچھا لگا ہے۔ ”پھر انہوں نے ایک اور اے درد مندی و خود نگری سے شعر پڑھا، گویا اپنے دل دلخ دار پر وہ جتنے مغموم ہیں، اسنے ہی شکیر بھی ہیں:

بیدل ز جگر سوختگی چارہ نہ دارم

با دلخ مرا لالہ صفت عہد قدیم است

پھر ارشاد ہوا، ”زبان و محاورہ الگ، لیکن یہ شخص شہنشاہ معنی تھا۔“

مرزا صاحب پھر خاموش سے ہو گئے۔ شاید شعر کی کیفیت میں گم تھے۔ اتنی دیر میں

بھنڈا دو پارہ تازہ ہو کر آگیا۔ پیر و مرشد متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا، ”حضور کل شام کو حاضری کی اجازت ہو۔ پرسوں صبح کی ڈاک سے میں انشاء اللہ چلا جاؤں گا۔“

فرمایا، ”اے ابھی آئے ابھی چلے۔ اے لو، میاں ذوق کا شعر پڑا آگیا:

لیجے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے

تم آہ لے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

کیا تو نری پرواہیں جانے کی غفلت ہے؟“

میں نے گزارش کی، ”جی جلدی تو کوئی خاص نہیں لیکن....“

”تو کیا کہہ کوئی منتظر ہے؟“

میرے دل پر چوٹ سی لگی، آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”اچھی حضرت، کھر ہے ہی نہیں۔

کانپور میں ہوں ضرور، لیکن غریب الدیار ہوں۔“

میری یہ کیفیت دیکھ کر مرزا صاحب نے بڑے نرم لہجے میں تفصیل پوچھی اور ہاسرار

پوچھی۔ میں نے بھی مجبور ہو کر سب بتا دیا۔ وہ بالکل سناٹے میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے،

”تو تم بھی نسیم صبح گاہی کی طرح خانہاں پر ہوا ہو۔ جیسی تو میں کہوں کہ یہ دل درد آشنا سچے

کو کہاں سے ملا۔ خیر چاہئے۔ رکھتے تو اچھا تھا۔ لیکن تمہاری مرضی۔ یہی کل شام کو ضرور آجانا۔“
 میں حسب وعدہ رات ڈھلے مرزا صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ کئی لوگ پہلے سے
 موجود تھے۔ ایک صاحب، جو مسن اور مشین تھے، مرزا صاحب سے کچھ پوچھ رہے تھے۔
 طالب علم تو نہیں، لیکن کہیں معلم گتے تھے۔ قبلہ و کعبہ نے فرمایا، ”ذرا وہ شعر پھر پڑھیے،
 میاں رسوا بھی سن لیں۔“

”حضرت، خاکائی کا شعر ہے،“ آنکھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ملاحظہ ہو:

دست آب وہ مجاورانش
 ارزن وہ برج کو ترا نش

اس کے معنی ملتے آرزوہ صاحب کچھ بتاتے تھے، لیکن میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔“
 ارشاد ہوا، ”سمجھیں بھی تو آپ کیسے۔ یہ شعر مشکوی ”تحدہ المراقین“ کا ہے، اس کے
 پہلے والے شعر سے اس کا ربط ہے۔ وہ شعر سامنے نہ ہو تو مطلب کیا ناک نکلے۔“ پھر ایک
 لہجہ تامل کر کے آپ نے شعر پڑھا:

روح از پئے آبروے خود را
 غلہ از پئے رنگ و بوے خود را

”کیسے، اب کچھ کہیے؟“

”جی، اب کچھ بات کھل رہی ہے۔“ مولوی صاحب بولے۔

”سنیے،“ مرزا صاحب نے فرمایا۔ ”یہ اشعار غلہ و کعبہ کی خاموش ہیں۔ استاد فرماتے ہیں،
 روح اپنی افزائش آبرو کے لیے کعبے کے مجاوروں کو وضو کا پانی دیتی ہے۔ اور غلہ، اخذ رنگ و بو
 کے لیے برج و کعبہ اللہ کے کبوتروں کو دلتہ کھلاتا ہے۔“

مولوی صاحب بولے۔ ”ایک قول یہ ہے کہ ’دست آب وہ‘ لقب ہے اشرف الانبیاء
 علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔“

مرزا صاحب نے فرمایا، ”دیکھو ان اشعار میں غافل موجود ہے۔ روح، کہ دست آب وہ
 ہے، اور غلہ، کہ ارزن وہ ہے۔ یہاں کون سا قرینہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا

ہے؟“

”جی، قریب تو کوئی نہیں، لیکن ایک جگہ خاقانی نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دستِ آب وہ کہا ہے۔ لوگ اسی سے استنباط کرتے ہیں۔“

”درست، لیکن وہ پورا فقرہ ہے دوستِ آب وہ رسالت۔ یعنی مصیبتِ رسالت کو تو ضو کے ذریعہ حزیہ روشن کرنے والا۔ بے شک یہ صفت حضور نبی آخر الزماں علیہ صلوٰۃ والسلام کی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے دوستِ آب وہ کے معنی نہیں بدلتے۔ دوستِ آب کے معنی ہیں ’وضو کا پانی‘، لہذا ’دوستِ آب وہ‘ کے معنی ہوئے، ’وضو کا پانی دینے والا‘۔ اس کے سوا طور کوئی معنی نہیں۔“

مولوی صاحب خاموش ہوئے تو میرزا صاحب اور دں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کئی لوگ جمع تھے۔ معلوم ہوا آج داستانِ کوئی کی محفل ہے۔ کبھی اردو، کبھی فارسی داستانِ امیرِ حمزہ سنی جاتی ہے۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب کو ان چیزوں سے بھی رعبت ہے۔ خیر، داستانِ گوشتِ ریف لائے۔ کھانا ہوا، اس کے بعد داستانِ کو صاحبِ ایک مسند کی ٹیک لگا کر ذرا بلند جگہ پر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے لیے انیوں کا گھولوا تیار کیا، ایک دو چسکیاں لیں۔ پھر داستانِ آغاز ہوئی۔ شاید میرا لحاظ کر کے آج خسرو ہندوستان لندھو رحمن سعدان کا بیان تھا۔ داستانِ کو صاحب کیا تھے، گویا ایک کل کی گڑیا تھی کہ لٹکے بہ لٹکے رنگ بدلتی تھی۔ ہر لٹکے پر قادر، ہر طرح کے لغات کے ماہر۔ رزم، بزم، ظلم، اور سب سے بڑھ کر عیاری کے دودھ قہے کہ لوگ چونک چونک کر اپنی جھینٹیں ٹٹولتے کہ کہیں عمرو میار نے ہداری بھی تو جھینٹیں نہیں تراش دیں۔

گلی رات تک محفل رہی۔ مرزا صاحب نے تقریباً آبدیدہ ہو کر مجھے رخصت کیا۔ صدرِ دروازے تک چھوڑنے آئے۔ پھر آنے اور خط لکھنے کی تاکید فرمائی۔ ادھر وہ اندر تشریف لے گئے، ادھر کلودارد نے ایک ریٹنی تھیلی میرے ہاتھ میں پکڑا دی، کہ نواب صاحب نے زادِ سفر عطایت کیا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ انکار کی تاب تھی اور نہ موقع۔ سراپا آکر دیکھا تو اکیادہ روپے مہری تھے۔

اس ایک بار کے علاوہ میں کبھی دلی نہ جاسکا۔ غلط لکھتے مجھے شرم آتی تھی، لیکن سال میں ایک دو بار کوئی تھنڈ میرا صاحب کے لیے بھجوا دیا کرتا اور دعا کی درخواست کرتا۔ کبھی بلخ آباد کے آم اور جو پور کی امرتیاں، کبھی اپنے مہارک پور کی ٹنگیاں اور پکڑیاں۔ کبھی کبھی ایک آدھ غزل ہست کر کے بھیج دیتا۔ لیکن انھوں نے اصلاحی غزل کبھی واپس نہ کی۔ شاید وہ مجھے شاکر و نہیں بلکہ حاشیہ بردار تصور کرتے تھے۔ کوئی بھی تعلق ان سے ہوتا، میرے لیے بہت ہوتا:

فی الجملہ نسبتہ بہ تو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

وہ مجھے اپنا دوست تصور فرماتے تھے تو میرے لیے اس سے بڑا عزلا کیا ممکن تھا۔

۱۸۶۵ء میں، انگریزوں کی وار و گیر درستائیز کے پورے دس سال بعد، مجھے اپنے کھار دوست سے خبر ملی کہ میری زمینیں داگراشت ہو گئی ہیں اور میرے گھرانے کو معافی مل گئی ہے۔ وہاں میرے گھرانے میں تھا ہی کون جو اس معافی سے مستفیض ہوتا؟ جس گڑھی میں میرے اجداد دعا کی سو برس رہے تھے اسے منہدم دیکھنے کے بعد میرے لیے بھی وہاں رہائی کیا تھا۔ میری ماں کے ایک عزیز بنارس میں عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے انھیں بلا کر سب جائیداد انھیں بے قیمت بیہ کر دی۔ کانپور میں مجھے تھائی کے سوا کوئی تعب نہ تھا۔ شادی میں نے کی نہیں۔ شاعری خوب چل نکلی تھی۔ توپ کے کارخانے میں تنخواہ اچھی تھی، عزت سے بسر ہو جاتی تھی۔

ایک دن فروری ۱۸۶۹ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میں نے ”مودعہ اخبار“ میں پڑھا کہ بلبل ہند، نجم الدولہ و دیر الملک، میرزا اسد اللہ خان غالب، مالک حقیقی سے جا ملے۔ میں نے آہ سرد بھری اور چپ ہو گیا۔ دل میں کہا، مرزا صاحب فرماتے تھے، اگر ہم خلاقی زمین و زماں سے قلم و نثر و نظم کا انصرام و انتظام بخوبی ہو چکا۔ اب اگر وہ چاہے گا تو میرا نام تا جو م القیام رہے گا۔ میرے دل نے کہا، آمین، ثم آمین:

لکھا ہے وہ سو برس تک جو لکھ جانے کوئے
لکھنے ہارا پاؤں لا سو گل گل مٹی ہوئے

میرزا کا نام ان کے بعد اور بھی چکا۔ ان کے شاگرد خواجہ حالی نے ”بادگار غالب“ نامی کتاب لکھی۔ [افضل اشاعت، ۱۸۹۶ء، مرتب] اس کے خوب چرچے رہے۔ شبلی صاحب نے فارسی مرزا نوشتہ کی نہ مانی تو کیا، خواجہ حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ غیر اہل زبان بھی فارسی پر قدرت تامہ رکھ سکتا ہے، اور میرزا صاحب کو یہ قدرت حاصل تھی۔ لاہور سے مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ”آب حیات“ چھپوائی [افضل اشاعت، ۱۸۸۸ء، مرتب] تو اس میں میرزا صاحب کی باتیں ایسے مزے مزے کی لکھیں کہ لوگوں میں میرزا صاحب کا نام اپنے دوستوں کے ناموں سامانوس ہو گیا۔ ابھی کچھ برس پہلے عظیم آباد کے کوئی صاحب ہیں، صلاح الدین خدا بخش، انھوں نے مرزا صاحب کا موازنہ جرمن کے کسی بہت بڑے شاعر سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو اس پر تفوق ہے۔ [یہ مضمون ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا، اس میں صلاح الدین خدا بخش نے غالب کو عظیم جرمن رومانی شاعر ہائے (۱۷۹۷ء تا ۱۸۵۶ء) پر فوقیت دی تھی، مرتب]۔

میں نے کہیں سنا کہ بھوپال میں کوئی ہونہار نوجوان، بجنوری نام کے ہیں۔ انھوں نے مرزا صاحب قبلہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ہمارے صاحب کا مرتبہ کسی یورپین شاعر سے کم نہیں۔ لیکن ان کی یہ تحریر ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ سنا جاتا ہے بجنوری صاحب ان دنوں بہت بیمار ہیں، اللہ انھیں شفا دے۔ [عبدالرحمن بجنوری کی جس تحریر کا ذکر بنی مادحہ رسوائے کیا ہے وہ نامکمل رہی اور بجنوری کے انتقال کے بعد ”محاسن کلام غالب“ کے نام سے نسخہ حمید یہ کے دیباچے کے طور پر بھوپال سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور نقد غالب میں اہم مقام کی مستحق قرار پائی۔ بجنوری کا انتقال ۱۹۱۸ء ہی میں ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۳ برس کی تھی، مرتب]۔

تھوڑی بہت انگریزی میں نے بھی پڑھی ہے۔ اتنا تو میں ڈنگے کی چوٹ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی انگریزی نظم میں وہ روانی اور وہ شوخی نہیں دیکھی جو میرے صاحب قبلہ کے اکثر اشعار میں ملتی ہے۔ میرے عجبانا صادق الوداد حضرت پور علی خاں نادر کا کوردی اور حضرت صدر گاسہائے سرور جہان آبادی نے انگریزی کے وافر ترجموں سے دامن بزد کو مالامال

کیا ہے۔ لیکن میں دہلی زبان سے کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ان میں سے کوئی نظم مرزا نوشا یا میر تقی کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔ دوسری زبان سے ترجمہ کرنے میں کچھ نہ کچھ ضائع ضرور ہوتا ہو گا یہ بات بھی ہے۔

مرزا صاحب کے مشکل اشعار کے معنی تو لوگ خود ان سے بھی پوچھ لیتے تھے، لیکن ان کے معتد بہ اشعار اردو کی شرح درگاہ پر شاہ صاحب دہلوی کے ایک لائق شاگرد میاں علم بریلوی نے لکھی۔ سنا گیا کہ ان کے سارے اردو کلام کی شرح خواجہ بدر الدین راقم نے حیدر آباد جا کر لکھی تھی۔ لیکن وہ مرہون اطمینان نہ ہوئی۔ پھر حیدر آباد ہی سے مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی نے اپنی شرح چھپوا کر عام کی [قول اشاعت ۱۹۰۰ء] مرتب۔ [مولوی صاحب کی علیت اور شعر حق میں شک کسی کافر کو ہو گا، لیکن ان کی شرح کو غیر جانب داری سے پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مرزا صاحب منظور سے کچھ کد ہے۔ سناؤں وہ خوب کرتے ہیں، سمجھتے وہ عمدہ نکالتے ہیں۔ لیکن یہ بھی لگتا ہے کہ خواہ مخواہ کی عیب چینی بغیر انھیں ممکن نہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک علی گڑھ کے بی۔ اے۔ پاس صاحب نے، جو کانپور ہی میں مقیم ہیں، میرزا صاحب کے دیوان کے ساتھ بعض بعض اشعار کی شرح بھی شائع کی ہے [قول اشاعت ۱۹۱۱ء، مرتب۔] حسرت مولائی ان کا نام ہے۔ ان دنوں قوی تحریکات میں حصہ لینے کے باعث جیل خانے میں ہیں۔ بڑے لائق اور گرامر مہنص ہیں۔ شریعین ان کی نہایت مختصر لیکن بڑی معنی خیز ہیں۔ شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ فنی حلیم کھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس لحاظ سے نواب نسیم دہلوی ان کے دلوں استاد ٹھہرے۔ فنی حلیم صاحب کا ایک شعر مجھے مراد دیتا ہے:

میں تو ہوں حلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھ کو طرز شاعرانہ لکھو سے کیا غرض

ان دنوں لکھنؤ، دہلی میں پھر تصویزی بہت فنی ہوئی ہے، درحالیہ کہ میر انشا، ابراہیم خان، انشا نے تو صاف صاف انھیں لکھنؤ والوں کو لائق اقتدار گردانتا ہے جو برہم راست دہلی سے آئے

ہوں، اور لکھنؤ میں جن کے گھر بچاؤ برس سے زیادہ پرانے نہ ہوں۔ اور یہ اُنھوں نے اس وقت کہا جب اودھ پر مرزا منگلی کاراج تھا۔ وہ جنت آرام گاہ اپنی زبان کو شاید دہلی ہی کی زبان قرار دیتے تھے۔ [ملاحظہ ہو ”دریائے لطافت“، عمرہ ۱۸۰ء، اول اشاعت ۱۸۵۷ء، مرتب۔] اتفاق میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے میرزا صاحب میں ایسا کوئی تعصب نہ تھا۔ وہ شیخ نارنج کے بھی قائل تھے اور خواجہ آتش کے بھی۔ ایک بار بے خیالی میں اُنھوں نے مرزا صاحب علی ایک سرور کی تصنیف ”فسانہ قاصد“ پر بڑے سخت جملے کہے تھے۔ لیکن ان اقوال میں تعصب نہ تھا، اپنی رائے کا بے لاگ اظہار تھا۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا صاحب خود اپنی زبان کے تئیں فرماتے تھے کہ اوروں کی نسبت فصیح تر ہے۔

میرزا صاحب منظور کے ارجمند کی تاریخیں بہت کبھی تھکیں۔ مولوی حالی نے غضب کا مرثیہ کہا۔ میرا ہی بہت چاہا کہ میں بھی مرثیہ کہوں۔ لیکن کبھی ایک دو مصرعے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدا معلوم کیوں رقت طاری ہو جاتی۔ لگتا کہ اپنے باپ دادا کا بھی مرثیہ کہہ رہا ہوں۔

مرزا صاحب کے گزرنے کی خبر کے کئی دن بعد تک میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کا قہر یہ کسے دوں۔ آخر دادا میاں کی درگاہ پر پانچ سیر شیرینی اور پانچ سیر کی شیر مالیں فاتحہ کرائیں اور تقسیم کر دیں۔ گھر آکر مرزا صاحب کی یادگار تحریر کو آنکھوں سے لگا کر دو آنسو رو لیا۔

آج جب کہ نومبر ۱۹۱۵ء کی آخری تاریخ ہے، میں انگریزی حساب سے افسر برس کا ہو گیا۔ اتنی عمر بہت ہوتی ہے، اُمید ہے کہ جلد ہی میرا بلدا آجائے گا۔ کہنے کی باتیں تو اور بھی تھیں:

کھفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی

من خود کسم آغاز بہ پلایں کہ رساند

میں نے وہی باتیں لکھی ہیں جن سے پڑھنے والے (اگر ان پر اکتدہ خیالیوں کا کوئی پڑھنے

والا ہوا) کو یہ تو معلوم ہو کہ میں کون تھا اور کن کن سے شرف ہم کلامی مجھے حاصل رہا

ہے۔ گزری باتوں کو پچاس سے زیادہ سال ہونے کو آئے، لیکن لگتا ہے ابھی ابھی انھیں خواب میں دیکھ کر اٹھا ہوں۔ میرے باپ ماں کی من موہنی صورتیں، دادا چان اور مولوی خدام حسین، ناظم کے نورانی چہرے، پوپاں راج کی سرحد پر انگریزی فوج کا تھوم اور ڈنکا شہاد کا ماتم کرتی ہوئی اور پوپاں کے راجہ کو کوستی ہوئی عورتیں۔

میرزا صاحب کی بارعب شخصیت، جس میں بلا کا حسن بھی تھا اور شوخی کے ساتھ عجب طرح کا حزن بھی۔ نواب ضیاء الدین خاں اور فشی شیو نرائن آرام۔ میر کاظم علی داستان گو۔ دتی کے آجڑے بگڑے کوپہ و ہزار، جن میں بھر بھی ایک غرور، ایک گردن افرازی کی شان تھی۔

اور میرزا من، میرا کھار دوست، اور وہ جسے بھی ۱۹۵۷ء نے کھالیا۔ جس پر کبھی میری نگاہ پڑتی تھی۔ شہاد ماتم نے شاید ہم جیسوں کے لیے کہا تھا:

اس وقت دل مرا ترے چہچے کے بچ تھا
جس وقت تو نے ہاتھ لگایا تھا ہات کو
سب جان و تن ملا تھا نہ تھا کچھ غلط مگر
دونوں کے دل اس آن ترستے تھے ہات کو

انگریز اتنی بڑی لڑائی ہارتے ہارتے جیت گیا۔ جرمن کو بھی شکست ہوئی۔ میرزا صاحب فرماتے تھے کہ غوث علی شاہ صاحب کا قول تھا، انگریز کا اقبال بلند ہے اس لیے اس کی عورتوں پر جن بھوت بھی نہیں آتا۔ اب میں اپنے جیتے جی تو اس اقبال میں کہن لگتے نہ دیکھ سکوں گا۔ اللہ بس باقی ہو س۔

اردو کی ادبی تاریخیں

ڈاکٹر میان چند

صفحات: ۹۴۴

قیمت: ۵۰ روپے

اردو کی ادبی تاریخوں کے اس جائزہ میں مصنف نے ادبی تاریخ نگاری کے نئے منظر اور ارتقا کے پیش نظر آب حیات، شعر الہند، گل و ہوا اردو ادب کی تاریخ، تاریخ نثر اردو، داستان تاریخ اردو، سر قاضی اردو کی ادبی تاریخ، علی گڑھ تاریخ ادب اردو، اردو کی کہانی، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ادبیات مسلمان پاکستان دہندہ، کلاسیکی اردو ادب، تاریخ اعلیٰ ادب، مختصر تاریخ ادب اردو، تاریخ نظم و نثر اردو، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، تعارف تاریخ اردو، اردو ادب کا تعارف جیسی منتخب تاریخ کے تفصیلی ذکر کے ساتھ ساتھ دلف دل میں میری فصل، گرامر ملی، سرام بابا سکینہ، علی جوہری، محمد صادق، انگریزی میں لکھی گئی اردو ادب کی تاریخوں کے جائزہ کے ساتھ ہی ادبی تاریخوں کے ارتقا کا مجموعہ اور جائزہ اور تجزیہ پیش کیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

غالب کے خطوط (جلد پنجم)

ڈاکٹر خلیق: نجم

صفحات: ۱۶۶

قیمت: ۱۰۰ روپے

غالب کے خطوط کو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری ادبی دنیا میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ غالب شاہی کے حوالے سے ادب کے قارئین یقیناً اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

جدید اردو افسانے کے رجحانات

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

قیمت: ۳۲۰ روپے صفحات: ۲۹۶

یہ کتاب ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے افسانے کے حدود و خال سے لے کر افسانے کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے جدید اردو افسانے کے ابتدائی نقوش، اس کے پس منظر میں افسانے کے روایتی دور سے حقیقت پسندی، ترقی پسند رجحانات کے ساتھ ساتھ سوانحی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کشش اور رویوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے اور ان میں جدیدیت، علامات نگاری، تجزیہ و اوراضی کی بازیافت جیسے میلانات کے حوالے سے جدید افسانے کو پرکھنے کی کاوش کی ہے۔

نوادیر ظفر

مرتب: شان الحق حقی

قیمت: ۲۰۰ روپے صفحات: ۳۵۳

مظاہر سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جن کی قیادت اور رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا اور ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جنگ لڑی گئی، اسی بہادر شاہ ظفر کے مختلف مجموعہ شاعری کا یہ ایک نمائندہ اور معتبر انتخاب ہے جس میں فاضل مرتبہ شان الحق حقی کا عاملانہ مقدمہ بھی شامل اٹھامت ہے۔ شان الحق حقی نے اس مقدمہ میں بہادر شاہ ظفر کی ادبی اور شعری خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ادبی مرتبے کا تعین کیا ہے۔

مثنویات شوق

مرتب: رشید حسن خاں

صفحات: ۳۰۶

قیمت: ۲۰۰ روپے

نواب مرزا شوق کی مثنویاں ”غریب عشق“، ”سہار عشق“، ”تذہر عشق“، ”دیرستان لکھنؤ“ کے اصلی لفظی ذوق کی مظہر ہیں۔ اردو زبان کی وہ نفاست اور لطافت جو ان مثنویوں میں ملتی ہے اس کی مثال دیگر مثنویات میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ محاورات پر عبور، رد و مزہ پر قدرت اور اسلوب و بیان کی جو سلاست ان مثنویوں میں موجود ہے اس کے سادگی، محرمات اور تہذیبی اثرات کے مطالعہ کے لیے ان مثنویوں کو پڑھا جانا ضروری ہے۔ رشید حسن خاں، مصنف کے اہم ترین محقق ہیں اور کلاسیکی متن مرتب کرنے میں دور جو اعتبار رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں کچھ مثنویوں کا مستند متن پیش کیا گیا ہے۔ تعلیقات، دعوائی اور فرہنگ کے اعتبار سے بھی یہ ایک بے مثال تحقیقی و علمی کارنامہ ہے۔

ایک وارڈن کی ڈائری

مترجم: احتفاظ الرحمن

صفحات: ۱۵۸

قیمت: ۱۰۰ روپے

یہ جہیہ جگن کی چھ انعام یافتہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں جگن کے مشہور افسانہ نگار ”نیو شین سو“، ”جی پی بیگ“، ”واک یا بیگ“، ”پلا جھوان“، ”واک جگ“، ”سو کو جگ“ کے افسانوی ترے شامل ہیں۔ ان افسانوں کو مشہور صحافی اور ادیب جناب احتفاظ الرحمن نے سلیس اور آسان زبان میں منتقل کیا ہے، احتفاظ الرحمن خود بھی بیگ کے دیرالترجمہ و اشاعت اور وہاں سے نکلنے والے اردو سارے ”جگن ہاؤس“ سے کافی عرصہ منسلک رہے ہیں۔

افکار عالیہ

مترجم: ڈاکٹر خان رشید / قاضی قیصر الاسلام

قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۲۲۷

اس کتاب میں فن، اخلاق، تغیر، جذب، محسن، عدل، فرض، تاریخ اور ارتقا جیسے موضوعات پر مغرب کے عظیم مفکرین کے افکار و خیالات کو مختصر سے مختصر تر خلاصے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جن کو ڈاکٹر خان رشید اور قاضی قیصر الاسلام نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ لوگ جو مشرقی فکر سے بڑی حد تک آگاہ ہونے کے باوجود مغرب سے ایسی آگاہی نہیں رکھتے ان کے لیے یہ مواد دلچسپی اور فکر انگیزی کا حامل ہے۔

شاہد احمد دہلوی حالات و آثار

ڈاکٹر سید محمد عارف

قیمت: ۲۰۰ روپے صفحات: ۳۲۷

شاہد احمد دہلوی معروف ادیب، مترجم اور مشہور ادبی ماہر تھے۔ ”ساقی“ کے مدیر تھے۔ وہ اپنی نثر پر احمد کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کے وہ ہوتے تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید محمد عارف کا پی ایچ ڈی کے لیے تحریر کیا جانے والا مقالہ ہے جس پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات کے حوالے سے تحریر کیا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے۔

مصنف کے کوائف

۴۴
پیدائش:

عس امر حنی فاروقی

۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء، انڈیا

تصانیف:

عقلمند ڈاک و بار کے اعلیٰ عہد سے رجوع ہوئے

لفظ و معنی

منجھ سوختہ

عروض آہنگ اور بیان

شعریات

اثبات و نفی

افسانے کی حمایت میں

The Secret Mirror

شعر شور انگیز

شعر غیر شعر اور نثر

داستان امیر حمزہ